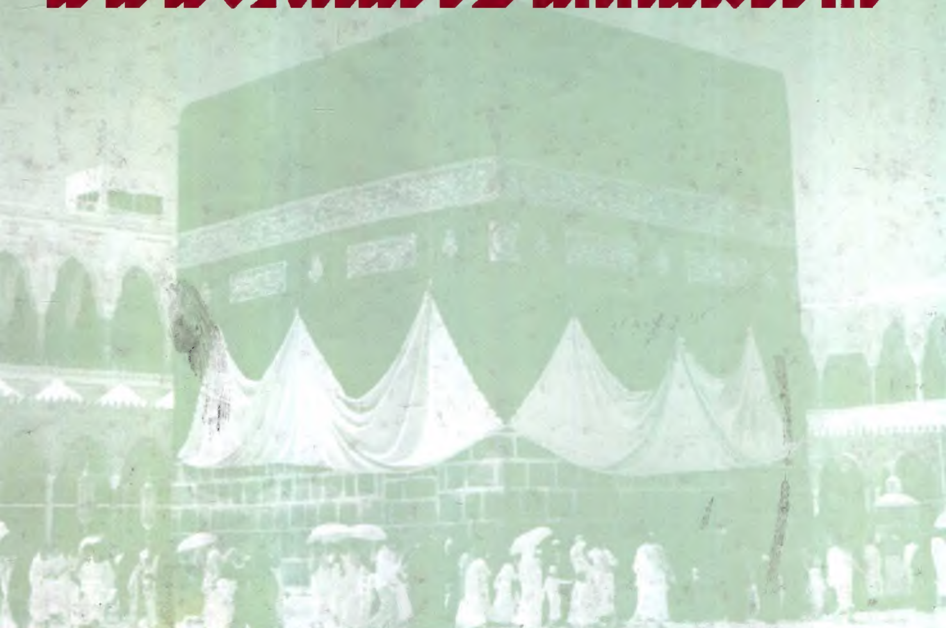
سفرنامہ حجاز

مولانا غلام رسول مہر



بسم اللہ الرحمن الرحیم

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

کتاب و سنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب ....

- عام قاری کے مطالعے کے لیے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد آپ لوڈ (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کی خاطر ڈاؤن لوڈ، پرنٹ، فوٹو کاپی اور الیکٹرانک ذرائع سے محض مندرجات نشر واشاعت کی مکمل اجازت ہے۔

☆ تنبیه ☆

- کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی ممانعت ہے۔
- ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی و شرعی جرم ہے۔

﴿اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں﴾

- نشر واشاعت، کتب کی خرید و فروخت اور کتب کے استعمال سے متعلقہ کسی بھی قسم کی معلومات کے لیے رابطہ فرمائیں۔

kitabosunnat@gmail.com
www.KitaboSunnat.com

سفر نامۂ حجاز

از

مولانا غلام رسول مہرؒ

مرتبہ

ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری

عبدالمجید کھوکھر یادگار لائبریری گوجرانوالہ

نام کتاب	سفر نامۂ حجاز
مصنف	مولانا غلام رسول مہرؔ
مرتب	ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری
طبع اول	۱۹۸۴ء
طبع دوم	۲۰۰۹ء
صفحات	۱۶۸
تعداد	۱۰۰۰

باہتمام

ضیاء اللہ کھوکھر ۸۳ بی ماڈل ٹاؤن گوجرانوالہ

فہرست

تعارف	۵
دیباچہ	۱۱
مسافر حجاز اور اس کا سفر نامہ	۱۵
عرضِ حال	۲۷
باب اول: لاہور سے کراچی	۲۹
باب دوم: کراچی سے جدّہ	۳۷
باب سوم: سرزمینِ مقدس حجاز	۶۵
باب چہارم: مکہ معظّمہ اور اس کے حوالی	۸۵
باب پنجم: حرم پاک کا ظالم کلید بردار	۱۰۹
باب ششم: ادائے فریضۂ حج	۱۱۵
باب ہفتم: ادائے فریضۂ حج کے بعد	۱۳۵
باب ہشتم: مراجعت کا بحری سفر	۱۴۶
باب نہم: مصنف رحمۃ للعالمین ـــــ آغوشِ رحمت میں	۱۶۲

○ ضیاء اللہ کھوکھر

تعارف

مولانا غلام رسول مہر نے خادم الحرمین الشریفین سلطان عبدالعزیز ابن سعود کی دعوت پر اس سفر مبارک کا عزم فرمایا تھا اور ۲۳؍اپریل ۱۹۳۰ء کو کراچی سے روانہ ہوئے۔ جوارِ حرم مقدس میں ۲۹؍مئی ۱۹۳۰ء تک انہیں مقیم رہنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ اس اثنا میں سلطان ابن سعود سے ان کی ملاقات ہوئی ان کی صحبت سے فیض یاب ہوئے اور سعادت حج سے بھی مشرف ہوئے۔ مولانا اسمٰعیل غزنوی اور چند دیگر احباب ان کے ہم سفر تھے۔ اس سفر مبارک کی ہر منزل کی، ہر مقام قیام کی صحبت و مصروفیت کی روداد روزنامہ ''انقلاب'' لاہور میں اپریل سے جولائی تک' خطوط کی صورت میں قسط وار شائع ہوتی رہی۔ یہ خطوط انہوں نے اپنے ہم مرتبہ شریک و سہیم اور ''انقلاب'' کے مدیر ثانی عبدالمجید سالک کے نام مختلف مراحل و مقامات سے ارسال کیے تھے۔

''انقلاب'' اپنے دور کا کثیر الاشاعت اور با اثر اخبار تھا جسے مولانا مہر اور عبدالمجید سالک نے ''زمیندار'' سے علیحدگی کے فوراً بعد ۲؍اپریل ۱۹۲۷ء کو لاہور سے جاری کیا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد اس اخبار نے برسرِ اقتدار طبقے کے ظلم و ستم اور ان کی سیاہ کاریوں اور قانون شکنیوں کا پردہ چاک کرنے کے لیے اپنے قلم کو حرکت دی تو حکومت کے زیرِ عتاب آ گیا۔ اس کے اشتہارات بند کر دیے گئے اور پھر نیوز پرنٹ کا کوٹا منسوخ کر دیا گیا۔ غیر قانونی دباؤ کے باعث ''انقلاب'' اپنی اشاعت برقرار نہ رکھ سکا لیکن جلد ہی سنبھل کر پھر میدان کارزار میں کود پڑا۔ ''انقلاب'' سیاسی اور نظریاتی اخبار تھا، جب کہ دیگر نجی اخبارات کے مالکان کو اپنے کاروباری مفادات عزیز تھے۔ ان

اخبارات کے کارندوں نے غیر اخلاقی اور غیر کاروباری طور طریقوں سے ''انقلاب'' کی ترسیل اور تقسیم میں سخت مشکلات اور روکاوٹیں پیدا کر دیں اسی طرح جیسے کراچی کے ایک اخبار کے مالکان روزنامہ ''انجام'' کے تمام شمارے مارکیٹ سے اٹھا لیتے تھے اور انھیں عوام تک پہنچنے نہیں دیتے تھے، جس سے یہ تاثر دینا مقصود تھا کہ ''انجام'' بند ہو گیا ہے، بالآخر اس کثیر الاشاعت اخبار کو صفحہ ہستی سے نیست و نابود کر دیا گیا۔ بہر صورت ''انقلاب'' بائیس بہاریں دیکھ کر ۱۰/اکتوبر ۱۹۴۹ء کو ہمیشہ کے لیے مطلعِ صحافت سے غروب ہو گیا۔

مولانا مہر کا یہ دوسرا سفرِ حجاز تھا۔ اس سے پہلے انہوں نے اکتوبر ۱۹۲۵ء میں حجازِ مقدس کا سفر اختیار کیا تھا اور وہ عمرے کی سعادت سے بھی فیض یاب ہوئے تھے۔ ۱۹۲۴ء میں سلطان عبدالعزیز ابن سعود انگریزوں کے آلۂ کار اور حاشیہ بردار شریف حسین اور اس کے حواریوں کو شکست سے دوچار کر چکے تھے۔ شریف حسین مکہ سے فرار ہو کر فلسطین چلا گیا' بعد ازاں اس کا بیٹا علی بھی مکہ چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور ہوا۔ ابن سعود اپنے لشکر کے ساتھ مکہ معظمہ میں داخل ہوئے۔ ان کے جانبازوں نے حرم شریف کے تقدس کا پورا احترام ملحوظ رکھا اور سلطان کی ہدایت پر مکہ معظمہ میں داخل ہونے سے پہلے ہتھیار پھینک کر احرام باندھ لیے اور لبيك اللهم لبيك لا شريك لك لبيك ان الحمد والنعمة لك والملك کا آوازہ بلند کرتے ہوئے حرم شریف میں داخل ہوئے اور اللہ کے حضور میں سر بہ سجود ہو گئے۔ انگریزوں نے ردعمل کے طور پر حجاز کے سیدھے سادھے بدو مسلمانوں کو وہابیوں کا نام دے کر ملتِ مسلمہ کو گمراہ کرنے کی کوشش کی اور مسلمانوں میں انتشار اور افتراق پھیلانے کے لیے یہ تک مشہور کر دیا کہ سلطان کی فوجوں نے روضۂ رسول مقبول ﷺ کے گنبد پر گولہ باری کی ہے۔ صورت حال کا موقع پر جائزہ لینے کے لیے مجلس خلافت کا جو وفد حجاز مقدس بھیجا گیا' اس میں مولانا غلام رسول مہر، مولانا ظفر علی خان کے معاون کی حیثیت سے شامل تھے۔ مولانا مہر اس وقت ''زمیندار'' کے عملۂ ادارت سے منسلک تھے۔ ''زمیندار'' فرنگیوں اور ان کے وظیفہ خور ایجنٹ شریف حسین کے مقابلے میں سلطان

بدالعزیز کے موقف کی حمایت میں مردانہ وار ڈٹا ہوا تھا۔

مولانا ظفر علی خان اور مولانا غلام رسول مہر ان حالات میں بے حد متحرک اور مستعد ہے۔ مولانا مہر اپنے مفکرانہ اور مدبرانہ مضامین اور مولانا ظفر علی خاں اپنی ولولہ انگیز نظموں سے سلمانانِ ہند کے دلوں کو گرماتے رہے، مولانا ظفر علی خاں کی یہ نظمیں ''زمیندار'' میں شائع ہوئیں، چند شعر ہدیۂ قارئین ہیں:

پھر شور ہے قبوں کا اور زور ہے جبوں کا	طبلہ ہے شریعت کا اور تھاپ ہے افرنجی
داخل ہوا مدینے میں ابنِ سعود آج	پھر جوش پر ہے رحمتِ ربِّ ودود آج
توحید کا عرب میں علم سر بلند ہے	قائم ہوئی ہیں شرعِ نبی کی حدود آج
اس جھوٹ کا کہ گنبدِ خضریٰ ہوا شہید	سلطان نے بکھیر دیا تار و پود آج

مولانا مہر نے نہایت احترام اور احتیاط کے ساتھ گنبد کا جائزہ لیا اور یہ پایا کہ گنبد پر گولہ باری کے کوئی آثار نہیں۔ مولانا مہر نے اپنے سفر کی روداد اور حجازِ مقدس میں اپنے قیامِ مشاہدات اور تجربات کی سرگزشت قلم بند کی جو روزنامہ ''زمیندار'' میں شائع ہوئی۔ یہ سفرنامہ مرتب ہوکر چھپ جائے تو اس دور کے بہت سے اہم حالات و واقعات تاریخ کے صحیح تناظر میں منظرِ عام پر آجائیں۔

زیرِ نظر سفرنامہ ۱۹۷۰-۷۱ء میں ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری نے اپنے ادبی اور دینی ذوق کی بنا پر جس میں مولانا مہر سے ان کی ذاتی عقیدت کا عنصر بھی محرک تھا ''انقلاب'' سے نقل کیا تھا اور جب مسافرِ حجاز سے اس پر نظرِ ثانی کی درخواست کی تو معلوم ہوا کہ یہ سفرنامہ مولانا مہر پہلے ہی نقل کروا چکے ہیں اور اس کے متن کی تصحیح بھی کر چکے ہیں۔ چنانچہ ابوسلمان صاحب کو مولانا مہر سے رجوع کرنا پڑا اور طے پا گیا کہ ڈاکٹر ابوسلمان ہی اسے شائع کرنے کا اہتمام بھی کریں۔

۱۶ر نومبر ۱۹۷۱ء کو مولانا مہر مرحوم کا حادثۂ انتقال پیش آگیا۔ اگرچہ اس کی اشاعت کا فیصلہ

ہو گیا تھا اور ایک صاحب جنھوں نے اسے شائع کرنے کا عزم ظاہر کیا تھا جب کئی سال تک اس کی اشاعت کا بندوبست نہ کر سکے اور پھر آخر میں اس کی اشاعت سے ہاتھ کھینچ لیا تو ان حالات میں مولانا مہر کے ایک نیاز مند مُشفق خواجہ مرحوم نے اس کی اشاعت میں دلچسپی کا اظہار کیا اور ابو سلمان صاحب نے مسودہ اُن کے حوالے کر دیا۔ لیکن اس کی کتابت، تصحیح اور طباعت وغیرہ کے تمام امور ابوسلمان کی نگرانی ہی میں طے پائے۔ ان مراحل سے گزرتے گزرتے بھی کئی برس گزر گئے لیکن ۱۹۸۴ء میں وہ وقت آ گیا جو قدرت نے اس کے اشاعت پذیر ہونے کے لیے مقرر کیا تھا۔ کتابی شکل میں یہ اس کی پہلی اشاعت تھی، جو مکتبہ اسلوب کراچی کے اہتمام سے شائع ہوئی۔

مولانا مہر نے اپنی ادبی سرگرمیوں کا آغاز شاعری سے کیا، مہر ان کا تخلص تھا۔ ان کی نظمیں ایک مدت تک ''انقلاب'' کے صفحۂ اول کی زینت بنتی رہیں۔ لیکن جلد ہی انھوں نے اپنے زورِ قلم کو اظہارِ خیال کے لیے نثر سے وابستہ کر لیا۔ ان کا اندازِ تحریر سادہ، بے تکلف اور پُر لطف ہے، مزید یہ کہ تصنع اور بناوٹ سے معرّیٰ ہے۔ قدرت نے انھیں اپنے افکار و خیالات کو موزوں الفاظ، سادہ و رواں تحریر اور دلکش اسلوب میں قاری کے دل و دماغ تک اتارنے کی اہلیت سے نواز رکھا ہے۔

مولانا ترجمے کے فن میں خوب مہارت رکھتے تھے۔ ان کے نامۂ اعمال میں چالیس سے زائد کتابوں کے اردو تراجم شامل ہیں جو بیان و زبان کے اعتبار سے اور خوبیٔ اظہار سے ترجمے سے زیادہ تصنیف کا درجہ رکھتے ہیں۔ پھر یہی نہیں مولانا غضب کے مکتوب نگار تھے۔ وضع داری اور رواداری کا یہ عالم تھا کہ موصول ہونے والے ہر خط کا فوری اور شافی جواب لکھنے پر مستعد رہتے تھے اور اس سلسلے میں اپنی غیر معمولی مصروفیات کو مزاحم نہیں ہونے دیتے تھے۔ مولانا کس قدر کثیر تعداد میں خطوط لکھتے ہوں گے اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس وقت تک مولانا کے خطوط کے تین مجموعے چھپ کر منظرِ عام پر آ چکے ہیں اور مزید دو منظرِ عام پر آیا ہی چاہتے ہیں۔

مولانا غلام رسول مہر ان اہلِ قلم میں سے ہیں جن کی تالیفات و تحریرات خواہ وہ ادب، تاریخ، سوانح، مذہب، سیاست وغیرہ کے مسائل اور کسی علم و فن کے دائرے میں ہوں، اللہ تعالیٰ نے ان کی

پذیرائی کے لیے اصحابِ ذوق کے دلوں کو کھول دیا ہے۔ان تحریرات اور تالیفات کے انتظار میں شائقین کا ایک وسیع حلقہ چشم براہ رہتا ہے جو ان کی کسی کتاب کے ظہورِ اشاعت کو خوشبو کی طرح محسوس کر لیتا ہے۔ ان کے لیے اخبارات و رسائل میں نقد و تبصرے کی اور تشہیر و فراہمی کے لیے کسی بازار میں دکان سجانے کے ضرورت پیش نہیں آتی۔ان کی کسی کتاب میں اصحابِ ذوق کی دلچسپی کا ایک ہی پہلو نہیں ہوتا۔کتاب کا موضوع خواہ کچھ ہو'اس میں بہ یک وقت زبان کی سادگی' روانی' لطافت' فراست' سلاست' طرزِ تحریر کی ندرت' حُسن تالیف و تدوین اور موضوع کی اہمیت و افادیت کی خوبیاں پائی جاتی ہیں جو ہر ذوق کے قاری کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہیں۔اس دعوے کی نہایت عمدہ مثال زیرِ نظر سفر نامہ ہے۔آپ اُن کا موضوع متعین کر لیجیے کہ آیا یہ سفر نامہ ہے' رپورتاژ ہے' تاریخ ہے' ادبی صحیفہ ہے' آثار الصنادید کا مجموعہ ہے یا کوئی مذہبی نوشتہ ہے آپ چاہیں تو اس کے دائرہ مضمون کو اور وسیع کر لیجیے! یہ تفسیر' حدیث' سیرت' فقہ یا فلسفۂ دین کی کوئی کتاب ہے ؟آپ دیکھیں گے کہ ہر قاری کے لیے اُس کے مختلف اور سب سے جدا ذوق کی تسکین کا اس میں وافر سامان موجود ہے۔ زبان کا حُسن اور ادب کے محاسن کی خصوصیات اس پر مستزاد ہیں۔ان کے علاوہ سنجیدہ لطائف' دلکش حکایات، پُر مزاح واقعات' عبرت انگیز بیانات اور بصیرت افروز مشاہدات کی مثالیں بھی ہر چند صفحات کے بعد دلوں کو اپنی طرف کھینچتی ہوئی مل جائیں گی۔ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ حُسن و رعنائی کے تمام عناصر اس درجے اعتدال و توازن کے ساتھ یوں نمایاں ہوئے ہیں کہ کوئی چیز اپنے محل میں نہ کم ہے نہ زیادہ! عبدالمجید سالک نے اس سفر نامے کے محاسن پر جو جامع اور سیر حاصل تبصرہ کیا ہے وہ سرگزشت ص ۲۸۱ سے نقل کیا جاتا ہے:

> "مہر صاحب نے حجاز کا جو سفر نامہ لکھا ہے اور بالاقساط "انقلاب" نے شائع کیا۔ وہ اپنی تفصیلات میں اس قدر مکمل تھا کہ میرے نزدیک محض اس کو پڑھ کر انسان حاجی ہو جاتا ہے۔گو دنیا اسے حاجی نہ کہے"

مولانا صرف بلند پایہ ادیب اور کامیاب مدیر ہی نہیں وقت کے مدبر اور مفکر بھی تھے بلکہ

وہ اعلیٰ پایے کے مورخ اور چوٹی کے محقق بھی تھے ۔ سرگزشتِ مجاہدین' جماعتِ مجاہدین' سیّد احمد شہید' اور ۱۸۵۷ء کے مجاہد اُن کی زندہ جاوید تالیفات ہیں۔تحریک اصلاح و جہاد اور ۱۸۵۷ء کے حوالے سے اُن کی کاوش تاریخ و تحریکاتِ ملّتِ اسلامیۂ ہند میں اُن کا عظیم لشان اور نا قابلِ فراموش کارنامہ ہے جو تاریخ و تحقیق کے ہر معیار پر پورا اُترتا ہے

۲۹ رمئی ۱۹۳۰ء کو مولانا مہرؔ جس بحری جہاز دارا سے واپس ہوئے اُسی میں قاضی سلیمان سلمانؔ منصور پوری بھی اپنے سترہ رفقا کے ساتھ سوار تھے ۔قاضی صاحب سخت علیل تھے اور اُن کا سانحۂ ارتحال ۳۰رمئی کو بحالتِ سفر جہاز ہی میں پیش آیا۔قاضی صاحب کی علالت' اُن کی وفات اور پھر اُن کی میت کی سپردِ آب کرنے کی روداد مولانا مہرؔ نے بڑی دل سوزی اور افسردگی کے ساتھ قلم بند کی ہے، جسے اس سانحۂ ارتحال کے ایک اہم اور چشم دید ماخذ کی حیثیت حاصل ہے۔

سفر نامۂ حجاز کا پہلا ایڈیشن ایک مدت سے بازار میں نایاب تھا۔پچھلے چند برسوں میں جب کہ راقم سفر ناموں پر کتابیات مرتب کرنے میں مصروف تھا' سفر ناموں کی ورق گردانی کے دوران میں مجھے شدت سے اس سفرنامے کی اہمیت اور اشاعت کی ضرورت کا احساس ہوا چنانچہ اس کی اشاعت کا قصد کر لیا۔اس علمی' ادبی اور دینی خدمت کی توفیق اگرچہ تاخیر سے ہو رہی ہے لیکن اللہ کا شکر ہے کہ تمام مراحلِ اشاعت بہ حُسن و خوبی اختتام کو پہنچ رہے ہیں

اس ایڈیشن کی تیاری کے لیے میں ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری کا شکر گزار ہوں کہ اُنھوں نے نہ صرف اپنے مفید مشوروں سے نوازا بلکہ اپنے بیش قیمت تحقیقی اور معلوماتی مقدمے بہ عنوان ''مسافرِ حجاز اور اُس کا سفر نامہ'' پر نظر ثانی کی زحمت اُٹھائی اور اس میں بعض توضیحات سے اسے مفید سے مفید تر بنانے کوشش کی۔

اُمید ہے کہ یہ ایڈیشن زبان و بیان اور تحریر و نگارش کی عام خوبیوں اور افادیت کے معلوم پہلوؤں نیز صحت کے خاص اہتمام سے بھی اصحابِ ذوق اور شائقینِ مطالعہ میں پذیرائی حاصل کرے گا۔

○ابو سلمان شاہ جہان پوری

دیباچہ

حضرت مولانا غلام رسول مہر مرحوم کا یہ سفر نامہ روز نامہ ''انقلاب'' لاہور کی مندرجۂ ذیل اشاعتوں میں شائع ہوا تھا:

۱-لاہور سے کراچی	۲۹/اپریل ۱۹۳۰ء
۲- کراچی سے جدہ (۱)	۲۹/مئی ۱۹۳۰ء
کراچی سے جدہ (۲)	۳۰/مئی ۱۹۳۰ء
۳-سرزمینِ مقدسِ حجاز (۱)	۱۴/جون ۱۹۳۰ء
سرزمین مقدس حجاز (۲)	۱۵/جون ۱۹۳۰ء
۴- مکہ معظمہ اور اس کے حوالی (۱)	۲۲/جون ۱۹۳۰ء
مکہ معظمہ اور اس کے حوالی (۲)	۲۴/جون ۱۹۳۰ء
۵-حرم پاک کا ظالم کلید بردار	۲۹/جون ۱۹۳۰ء
۶-ادائے فریضۂ حج (۱)	۶/جولائی ۱۹۳۰ء
ادائے فریضۂ حج (۲)	۸/جولائی ۱۹۳۰ء
۷-ادائے فریضۂ حج کے بعد	۱۳/جولائی ۱۹۳۰ء
۸-مراجعت کا بحری سفر	۲۰/جولائی ۱۹۳۰ء
۹-مصنف رحمۃ للعالمین آغوش رحمت میں	۲۳/جولائی ۱۹۳۰ء

سفر نامے کی یہ اقساط اپنے مواد اور ترتیب کے لحاظ سے ایسی موزوں تھیں کہ ان میں کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی، صرف ابواب کے عنوان بڑھا دیے ہیں۔ اب یہ اپنے آغاز سے اختتام تک ایک کامل درجے کی مرتب ومبوب تصنیف ہے۔

یہ سفر نامہ مولانا مہر مرحوم کی زندگی میں انقلاب سے نقل کر لیا تھا لیکن جب مولانا مرحوم سے اس پر نظر ثانی کی درخواست کی اور ان کے علم میں یہ بات آئی تو پتا چلا کہ ایک اور عزیز محمد عالم مختار حق بھی اسے نقل کر چکے ہیں اور ان کے مسودے پر مولانا نے اصلاح بھی دے دی ہے۔ چنانچہ ان عزیز سے مولاناؒ کا اصلاح شدہ مسودہ لے کر اپنے مسودے کو درست کیا اور ایک دوست کا شوق دیکھ کر اشاعت کے لیے ان کے حوالے کر دیا۔ انھوں نے کتابت بھی کر والی لیکن پھر تاخیر وتعویق کے ساتھ کچھ ایسے حالات پیش آئے کہ اشاعت میں رکاوٹ پیدا ہو گئی۔ اس واقعہ پر چار پانچ برس بیت گئے اور جب سابقہ انتظام کے تحت اس کی اشاعت کی طرف سے بالکل مایوسی ہو گئی تو اشاعت کے نئے انتظام کی جستجو ہوئی، اگرچہ یہ مرحلۂ جستجو آسان نہ تھا لیکن خدا کے فضل وکرم سے طے پا گیا۔

یہ سفر نامہ ۱۹۳۰ء میں لکھا گیا تھا لیکن اب نصف صدی سے زیادہ مدت گزرنے کے بعد کتابی شکل میں اس کی اشاعت کا سروسامان ہوا ہے تو حرم سے لے کر بیرون حرم تک اور مکہ مکرمہ زاد اللہ شرفہا سے لے کر حوالیٔ مکہ تک دستِ انقلاب واصلاح ذوق تزئین وآرائش نے ایک عظیم تغیر رونما کر دیا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ سفر نامے کے بعض پہلوؤں کی طرف اشارہ کر دیا جائے۔

مولانا مرحوم نے مکہ مکرمہ کی جن قدیم عمارتوں اور تاریخی مقامات کا ذکر کیا ہے اور حرم اور اس کے گردوپیش کا جو نقشہ بیان کیا ہے اب اس میں عظیم تغیر اور زمین آسمان کا فرق رونما ہو گیا ہے۔ مولانا رحمہ اللہ نے حرم کی توسیع وتعمیر کے لیے بعض تجاویز پیش کی تھیں، حکومت سعودیہ نے مولانا رحمہ اللہ کے مشورے سے نہ سہی، تجربے اور ضرورت کی بنا پر وہی کیا جو مولانا مرحوم کے قلب سلیم کی صدائے پُردرد تھی۔

حرم کے اندر مطاف، رواق وغیرہ کی جو حالت بیان کی ہے اور فرش و عمارات کی جو کیفیت لکھی ہے، اس میں عظیم انقلاب آ گیا ہے۔ اب حرم کے حُسن و جمال اور عمارات کی خوبی کا عالم بیان سے باہر ہے۔ مسعیٰ میں جہاں تپتی دھوپ میں سعی کرنا دشوار ہوتا تھا اور سنگریزوں سے تلوے چھلنی ہوتے تھے۔ اب وہاں خوب صورت ستونوں پر مرصّع چھت قایم ہے اور رنگین پتھروں سے فرش مزین ہے۔ درو بام اور فرش و سقف کے حسن کا عالم دیدنی ہے۔ اب اس پر سے نظر پھسل پھسل جاتی ہے، فرش کی خنکی قلب میں اثر کرتی محسوس ہوتی ہے اور رُوح کو طمانیت حاصل ہوتی ہے۔ اُس وقت جہاں بگولے اٹھتے تھے، آج وہاں کے دل کش منظر سے آنکھیں ٹھنڈک پاتی ہیں۔ حرمِ مقدس اور مکہ مکرمہ کی تاریخ وہی رہی لیکن موجودہ زمانے کی آرایش و زیبایش دیکھ کر قدیم حالت کا تصور کرنا بھی دشوار ہو گیا ہے۔

اس سفرنامے کے مطالعے کے دوران اس بات کا خیال بھی رکھنا چاہیے کہ حوالیِ مکہ کے مقامات ۱۹۳۰ء میں جن ناموں سے معروف تھے، اب ان سے کوئی واقف نہیں رہا، مولاناؒ نے اپنے سفرنامے میں حرم پاک، مکہ اور حوالیٔ مکہ کے بعض نقشے بھی پیش کیے ہیں، آج ان کی افادیت کا دایرہ بہت محدود ہو گیا ہے، لیکن اُس دور کے حالات کے جایزے کے لیے ان کی اہمیت ضرور ہے۔ اس لیے اُن نقشوں کو سفرنامے سے خارج نہیں کیا۔

آج اگر مولاناؒ زندہ ہوتے تو اسے مطبوعہ صورت میں دیکھ کر بہت خوش ہوتے اور کتنی ہی بزرگانہ دُعاؤں سے نوازتے۔ مجھے امید ہے کہ اس کی اشاعت سے مولانا کے اخلاف، احباب اور معتقدین ضرور خوش ہوں گے، لیکن آہ! آخر اس کا کیا مداوا ہو سکتا ہے کہ مرحوم کی مشفقانہ تربیت اور اُن کی بزرگانہ دُعاؤں سے محروم ہوں۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنی بے پایاں عنایات سے نوازے اور قُربِ رحمت میں جگہ دے۔

اس سفرنامے کی نقل میں سہولت کے لیے کتب خانہ نیشنل بنک آف پاکستان (کراچی) کے محترم لائبریرین اور مسوّدے کی اصلاح کے لیے برادرِ محترم محمد عالم مختار حق صاحب کا رہینِ منت اور سپاس گذار ہوں۔

○ ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری

مسافرِ حجاز
اور
اُس کا سفر نامہ

مولانا غلام رسول مہر برِ صغیر پاک و ہند کی ایک نادر الوجود شخصیت تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں علم وفکر کے بہترین محاسن اور اخلاق و سیرت کے اعلیٰ خصایل سے نوازا تھا۔ یہ بھی اسی کارسازِ حقیقی کا الطاف و کرم تھا کہ انھیں اپنے علم اور تحریر و نگارش کی صلاحیتوں سے ملت اسلامیہ کی اصلاح و تربیت اور قوم کی رہنمائی کی توفیق نصیب ہوئی۔

مولانا مہر اُردو کے بلند پایہ ادیب اور صاحب طرز انشاپرداز تھے۔ صحافت میں وہ مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی اور ظفر علی خاں کی صف کے صحافی تھے اور ایک عالی دماغ مورخ بھی!

مولانا غلام رسول مہر ۱۵/اپریل ۱۸۹۵ء کو ضلع جالندھر (مشرقی پنجاب) کے موضع پھول پور میں پیدا ہوئے۔ پھول پور جالندھر سے چھ میل کے فاصلے پر آباد ہے۔ اُن کے والد کا نام چودھری محمد علی خاں تھا۔ مہر صاحب ابھی گیارہ سال کے تھے کے ان کے والد نے داعیِ اجل کو لبیک کہا، مہر صاحب مرحوم چار بہن بھائی تھے، وہ اپنے بہن بھائیوں میں سب سے بڑے تھے، مہر صاحب سے چھوٹی بہن تھیں، ان سے چھوٹے بھائی تھے جن کا نام امیر احمد خاں تھا۔ فروری ۱۹۶۹ء میں ۶۸ سال کی عمر میں انتقال ہوا۔ ان سے چھوٹی ایک اور بہن تھیں جو ۱۹۱۷ء میں ۱۳، ۱۴ سال کی عمر میں فوت ہوئیں۔

مہر صاحب کے والد نے انتقال سے پیشتر ان کی والدہ اور ان کے ماموں کو صرف یہ

وصیت کی تھی کہ غلام رسول کی تعلیم میں فرق نہ آئے۔ مہر صاحب کے والد علاقے کے کھاتے پیتے لوگوں میں سے تھے۔ والد کے انتقال کے بعد مہر صاحب کو خاصی زمین ورثے میں ملی تھی۔ والدہ نے اپنے مرحوم شوہر کے انتقال کے بعد ایک خاص انداز و معیار سے زندگی کے شب و روز گزارے۔ وہ معمولی لباس پہنتیں، سادہ غذا استعمال کرتیں، نماز پابندی سے ادا کرتیں، اکثر روزے رکھتیں۔ اس وجہ سے ان کی صحت پر خاصا اثر پڑا۔ ان کی یہ سادگی صرف اس وجہ سے تھی کہ مرحوم شوہر کی وصیت کی تکمیل میں کسی مرحلے میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو جائے۔ حال آں کہ اس قسم کا کوئی خطرہ نہ تھا کہ ان کے اچھا کھانے اور اچھا پہننے سے معاشی حالات متاثر ہوں گے اور وصیت کے پایۂ تکمیل کو پہنچانے میں کوئی دشواری پیش آجائے گی! لیکن وہ ایک خاص عزم اور حوصلے کی خاتون تھیں۔ انھوں نے شوہر کے انتقال کے بعد زندگی کی جو خاص وضع اختیار کر لی تھی، اُس پر وہ اس وقت بھی قائم رہیں جب مہر صاحب تعلیم سے فراغت کے بعد ملازم ہو گئے تھے اور زمین سے فواید کے علاوہ بھی ان کی خاصی آمدنی ہونے لگی تھی۔ ۱۹۴۱ء میں اس نیک سیرت اور پاکیزہ خصال خاتون کا انتقال ہو گیا۔ مولانا مہر صاحب کو اُن کے سایۂ شفقت اور بے غرض ترین دُعاؤں سے اپنی محرومی کا بہت افسوس ہوا۔ اور یہ احساس اُن کے آخر وقت تک قائم رہا۔ مہر صاحب کی تعلیم و تربیت میں مرحومہ کا بڑا حصہ تھا۔

مہر صاحب کی تعلیم کی ابتدا گاؤں کے مکتب سے ہوئی۔ میٹرک مشن ہائی اسکول جالندھر سے پاس کیا۔ مزید تعلیم کے لیے وہ لاہور آگئے جہاں انھوں نے اسلامیہ کالج سے ۱۹۱۲ء میں انٹرمیڈیٹ کیا اور مئی ۱۹۱۵ء میں بی اے کے امتحان سے فارغ ہوئے۔

۱۹۱۳ء میں جب کہ وہ انٹرمیڈیٹ کے طالب علم تھے، مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم سے متعارف ہوئے اور ان کی جماعت ''حزب اللہ'' کے رکن بنے۔ یہ گویا اپنی پوری زندگی میں خدا کی رضا اور خوشنودی کو مطمحِ نظر قرار دینے اور اسی کے لیے جینے مرنے کا عہد اور اسلام اور مسلمانوں کی خدمت گذاری کا ایک دائمی پیمان تھا۔ ''الہلال'' کے مطالعے نے ان کے

پیمان کو مستحکم کر دیا۔

''الہلال'' ۱۹۱۴ء میں ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے تحت بند ہو گیا تھا۔ ۱۹۱۵ء میں حزب اللہ کے منصوبے کے تحت دارالارشاد کے نام سے کلکتے میں مولانا آزاد نے مسلمان نوجوانوں کے لیے قرآن حکیم کے درس و مطالعے اور تعلیم و تربیت کا ایک مرکز قایم کیا تھا۔ ''الہلال کے نہ ہونے سے دعوت الہلال کے احیا کے سلسلے میں ''البلاغ'' کا اجرا عمل میں آیا تھا۔ مولانا مہر نے ارادہ کر لیا تھا کہ وہ کچھ دن کلکتہ میں رہ کر مولانا آزاد کے درس و صحبت سے استفادہ کریں گے اور پھر دین کی خدمت اور ملت کی رہنمائی کے لیے صحافت کے پیشے کو ذریعہ بنائیں گے۔ لیکن مولانا مہؔر کے عزم نے ابھی عمل کی صورت اختیار نہ کی تھی کہ حکومت بنگال نے مولانا کو نہ صرف کلکتہ سے خارج البلد کیا تھا بلکہ پورے بنگال میں کسی جگہ بھی ٹھہرنے کا حق ان سے چھین لیا تھا۔ یوپی، دہلی، پنجاب کی حکومتوں نے اپنے حدود میں مولانا کے داخلے پر پہلے ہی پابندی لگا رکھی تھی۔ بعد میں بمبئی پریسیڈنسی کی حکومت نے بھی، جس میں اس وقت صوبۂ سندھ کا موجودہ علاقہ بھی شامل تھا، ایسا ہی کیا۔ مولانا آزاد بہار میں رانچی کے مقام پر جا کر مقیم ہو گئے کچھ عرصے کے بعد انھیں وہیں نظر بند کر دیا گیا، جس کا سلسلہ ۳۱ر دسمبر ۱۹۱۹ء تک جاری رہا اس صورتِ حال سے دارالارشاد کے مدرسۂ فکر، تعلیم و تربیت کے مرکز اور دعوتِ الہلال کی اشاعت کا تمام نظام اور کاروبار خدمتِ دین و ملت درہم برہم ہو گیا اور مولانا آزاد کی ذات بابرکات سے استفادے کی جو آرزو مہؔر صاحب کے دل میں تھی، وہ پوری نہ ہو سکی۔

رانچی کی نظر بندی سے رہائی کے بعد جب مولانا آزاد نے تحریکِ تنظیمِ جماعت شروع کی تو پنجاب اس تحریک کا خاص میدان تھا۔ پنجاب کے جن اکابر علما اور دیگر شخصیتوں نے اس دعوت پر لبیک کہا۔ ان میں مولانا سید محمد داؤد غزنوی، مولانا محمد اسماعیل سلفی، مولانا عبدالقادر قصوری، مولانا عبداللہ قصوری، مولانا محی الدین قصوری، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم خاص طور پر قابل ذکر ہیں جنھوں نے اس سلسلے میں مولانا آزاد کے ہاتھ پر بیعت کی تھی، مولانا مہر

صاحب بھی انھیں مخلصینِ ملت میں سے تھے جنھوں نے تحریکِ نظمِ جماعت کی اہمیت کو سمجھا اور اس کے لیے اپنی زندگی کو پیش کر دیا۔ بیعت کی سعادت انھیں ۱۹۲۳ء میں حاصل ہوئی تھی۔

مولانا آزاد سے ابتدائے تعارف اور حزب اللہ کی رکنیت سے لے کر مولانا کی وفات ۲۲ر فروری ۱۹۵۸ء تک تقریباً پینتالیس سال تک رشتۂ ارادت و عقیدت قایم رہا۔ اس مدت میں چند ایسے مواقع بھی پیش آئے، جب بعض ملکی اور سیاسی معاملات میں مہر صاحب نے مولانا آزاد کی راے سے اختلاف کیا، لیکن مولانا سے ان کے رشتۂ ارادت اور اخلاص و محبت میں فرق نہیں آیا۔ مہر صاحب مرحوم مولانا کی عظمت، ان کی دینی و جاہت، ان کی قومی و ملی خدمات اور محاسنِ اخلاق و سیرت کے دل سے معترف تھے۔ آخر میں وہ ان کی نظر و بصیرت کے بہت قائل ہو گئے تھے اور مولانا کے فضائل و محامد کے بیان میں وہ رطب اللسان رہتے تھے

تعلیم سے فراغت کے بعد مہر صاحب جو عرصہ مولانا آزاد کی صحبت میں گزارنا چاہتے تھے اور پھر ملت کی خدمت کے لیے صحافت کے پیشے کو اختیار کرنا چاہتے تھے، ان میں مذکورہ بالا موانع پیش آئے اُن کا اصل سبب جنگِ عظیم تھی۔ جنگِ عظیم کی وجہ سے ملک جن حالات سے گزر رہا تھا۔ ان میں اخبار نکالنے کی آرزو بھی پوری ہوتی نظر نہ آتی تھی۔ ان حالات میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے اور بے مصرف زندگی کے روز و شب گزارنے کے بجاے حیدر آباد دکن کے لیے رختِ سفر باندھا اور پایہ گاہ وقار الامرا کے محکمۂ تعلیم سے وابستہ ہو گئے۔ اور تقریباً چھ سال تک انسپکٹر آف اسکولز کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔

پایہ گاہ وقار الامرا کے قیام کے دوران ان کی زندگی کا ایک اہم واقعہ پیش آیا۔ جس نے ان کی مذہبی زندگی کے انداز کو بدل دیا۔ ''الہلال'' کے مطالعے اور مولانا آزاد سے تعلق نے علماے حق کے ایک خاص سلسلے سے ان کی دل کی گہرائیوں میں ارادت اور محبت پیدا کر دی تھی، لیکن اس کے باوجود وہ ابھی تک رسمی اور روایتی زندگی کے پابند تھے۔ لیکن یہاں انھیں ایک ایسے عالمِ دین کی صحبت نصیب ہوئی جس کی بدولت کتاب و سنت سے تمسک و تعلق کا ذوق پیدا ہوا اور پھر تقلید و روایت پرستی کے بجاے وہ آخر تک اسی مسلک پر قائم رہے۔

جنگِ عظیم کے خاتمے کے بعد سیاسی قیدیوں اور نظر بندوں کو رہائی ملی۔ اخبارات پر سے بھی پابندیاں اٹھائی جانے لگیں، سختیاں کم ہوئیں اور ملک وملت کی خدمت کا ایک زیادہ وسیع میدان نظر آیا۔ مہر صاحب نے بھی حیدرآباد دکن سے رخت سفر باندھا۔ حیدرآباد چھوڑنے کی وجہ کسی حد تک یہ بھی تھی کی مولانا آزاد مرحوم کی گرفتاری کے بعد "الہلال" کے دفتر اور پریس کی تلاشی میں حزب اللہ کے ارکان کا رجسٹر بھی پولیس کے ہاتھ لگا تھا۔ اس میں مہر صاحب کا نام بھی تھا۔ نتیجتاً پولیس نے "پھول پور" کی مالوف بستی سے لے کر حیدرآباد دکن اور پایہ گاہ وقار الامرا تک ان کا تعاقب کیا۔ اس تفتیش سے حیدرآباد دکن کی مخصوص فضا میں اُن کے لیے اطمینان وترقی کے مواقع باقی نہیں رہے تھے۔

پنجاب واپسی کے بعد ان کا ارادہ اخبار نکالنے کا تھا، لیکن بعض دوستوں کے مشورے سے اوّلاً وہ نومبر ۱۹۲۱ء میں "زمیندار" لاہور سے وابستہ ہوگئے۔ لیکن مہر صاحب کے عزیزوں کو خصوصاً والدہ ماجدہ کو "زمیندار" سے ان کا یہ تعلق گوارا نہ تھا۔ کسی ایسے اخبار کی ادارت جو گورنمنٹ کی پالیسی کی ترجمانی اور اس کے مفاد کی نگہبانی کی جگہ ملک وملت کے مفاد کے لیے گورنمنٹ سے حریفانہ نبرد آزما ہو، آزمائش سے خالی نہ تھی۔ والدہ ماجدہ کو گوارا نہ ہوا کہ ان کی امیدوں کا سہارا کسی خطرے سے دوچار ہو۔ اس لیے وہ مزاحم ہوئیں۔ مہر صاحب نے والدہ ماجدہ کے جذبات کے احترام میں "زمیندار" سے تعلق کو ختم کر لیا لیکن چند ہی دن بعد زمیندار سے دو ہزار روپے کی ضمانت طلب کی گئی اور پندرہ بیس روز تک اخبار بند رہا۔ جب ضمانت داخل کر دینے کے بعد "زمیندار" دوبارہ جاری ہوا تو ملک وملت کی خدمت کا جذبہ رکھنے والے احباب نے مہر صاحب کے اعزہ اور والدہ ماجدہ کو راضی کر لیا اور مہر صاحب فروری ۱۹۲۲ء میں دوبارہ "زمیندار" میں آگئے۔ اور ادارت کے فرائض انجام دینے لگے۔

ابتدا میں مولانا مہر کا ارادہ اپنا اخبار نکالنے کا تھا لیکن "زمیندار" سے وابستہ ہونے کے بعد یہ خیال ترک کر دیا۔ اس لیے کہ مقصود خدمت حق تھا۔ اور اس کے لیے "زمیندار" میں

مناسب مواقع موجود تھے۔ پھر آہستہ آہستہ حالات نے ایسی صورت اختیار کر لی کہ ''زمیندار'' سے تعلق رکھنا ان کے لیے مشکل ہو گیا، شفاعت احمد خاں بہت پہلے الگ ہو چکے تھے۔ سالک صاحب نے رخصت لے لی تھی۔ مہر صاحب نے بھی رخصت کے لیے درخواست دے دی تھی۔ مولانا ظفر علی خاں کو مہر و سالک کی علاحدگی منظور نہ تھی۔ لیکن خواہش وعزم کے باوجود انھیں حالات کی درستی پر بھی قابو نہ تھا۔ اس کے باوجود مہر و سالک نے ان کی خواہش کا احترام کیا اور اخبار سے قطع تعلق کا ارادہ ترک کر دیا۔ لیکن مارچ ۱۹۲۷ء میں اچانک ایسی صورتِ حال پیدا ہو گئی کہ دونوں کو بیک وقت اخبار سے الگ ہو جانا پڑا۔ اور ان حضرات کی طرف سے کسی تحریک کے بغیر عملے کا بیشتر حصہ بھی زمیندار سے الگ ہو گیا۔ عملے میں ایڈیٹر، مترجم، کاتب، پروف ریڈر وغیرہ سبھی لوگ تھے۔ اس صورت حال نے اخبار نکالنے کی تحریک پیدا کر دی اور ایک ہفتہ کے اندر اخبار کے اجرا کا بندوبست کر لینا پڑا۔ یہ اخبار ''انقلاب'' کے نام سے نکلا۔ جس کا پہلا پرچہ ۲/اپریل ۱۹۲۷ء کو شائع ہوا۔ صفحہ اول حضرت علامہ اقبالؔ کی ایک نظم سے آراستہ تھا۔ علامہ مرحوم نے یہ نظم خاص اسی موقعے کے لیے کہی تھی۔ نظم کا پہلا بند یہ ہے:

خواجہ ازخونِ رگ مزدور سازد لعل ناب
ازجفاے دہ خدا یاں کشتِ دہقاناں خراب

انقلاب، انقلاب، اے انقلاب

''انقلاب'' نے خالص سیاسی، انتظامی اور دستوری مسائل پر مفصل مباحث کا آغاز کیا۔ ترک موالات کے دور میں جن جذباتی مضامین و مقالات کا عام رواج ہو چکا تھا ان کی جگہ مخصوص قومی اور ملکی مباحث کی طرح ''انقلاب'' ہی نے ڈالی۔ اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے انقلاب کی آواز کو پذیرائی کا شرف بخشا۔

''انقلاب'' کو ۱۹۴۹ء میں حالات کی نامساعدت کی بنا پر بند کر دینا پڑا۔ آخری پرچہ ۱۰/اپریل کو شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد مہر صاحب ہمہ تن تصنیف و تالیف کے کاموں میں

مصروف ہو گئے۔ تاریخ ان کا خاص موضوع تھا۔ خصوصاً تاریخ اسلام اور تاریخ اسلامیان ہند پر ان کی گہری نظر تھی ، برصغیرِ پاک و ہند میں مسلمانوں کی علمی، سیاسی، ثقافتی تحریکات، جدّ و جہدِ آزادی کے مراحل اور نشیب و فراز ،ان کے جلی و خفی گوشوں اور ہر شعبہ زندگی سے تعلق رکھنے والی شخصیات پر ان کے عبور و تبحر کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ وہ برصغیر کی سیاسی تاریخ کے اہم واقعوں اور فیصلوں کے واقعی پس منظر،سیاسی جماعتوں کے واقعی عزائم، حقیقی مقاصد اور راہ نماؤں کی ذاتی و سیاسی سیرت کے سرائر و خفایا سے بخوبی واقف تھے۔

مولانا مہرؔ صاحب کے قلم سے تقریباً ڈیڑھ دو سو کتابیں نکلی ہیں۔ان میں تاریخ و سوانح، مذہب وسیاست،تہذیب وتمدن ،علوم وفنون وغیرہ مختلف موضوعات پر کتابیں ہیں۔ انھوں نے تحقیقی اور تنقیدی کتابیں اور شرحیں بھی لکھی ہیں۔کتابیں مرتب بھی کی ہیں اور بہت سی کتابیں ترجمہ بھی کی ہیں۔ تاریخ،سوانح ،ادب وتنقید ،مذہب و سیاست اور مختلف موضوعات پر لاتعداد مقالات اس کے علاوہ ہیں۔ ان تمام حالات کو دایرۂ شمار میں لانا آسان نہیں۔ انھوں نے اپنی اٹھائیس سالہ اخباری زندگی میں ایک تخمینے کے مطابق متوسط سائز کی کتاب کے تقریباً چالیس ہزار صفحات لکھے ہیں۔ یہ ایک محتاط اندازہ ہے،اس میں مبالغہ کو قطعاً دخل نہیں۔ مہرؔ صاحب ہی کا بیان ہے:

> ’’اب تک جتنی خامہ فرسائی کی اس کے نتائج کی وسعت کا کوئی اندازہ ذہن میں موجود نہیں۔ میں نے اٹھائیس سال اخبار نویسی میں صرف کیے جو ذہن اور بدنی قوتوں کے بہترین سال تھے ،اور وہ بھی روزنامہ نویسی میں!ایک مرتبہ اس زمانے کے صرف افتتاحی مقالات کا سرسری حساب کیا تھا اور اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ متوسط سائز کی ہر جلد پانچ سو صفحے کی رکھی جائے تو میرے لکھے ہوئے مقالات افتتاحیہ کم وبیش اَسّی جلدوں میں سمائیں گے‘‘۔

بعض شخصیات پر انھیں لکھتے ہوئے قرن گزر چکے ہیں مثلاً اقبالؔ اور غالبؔ ،جن پر ان کے سیکڑوں مقالات ہیں۔ ۱۹۶۹ء میں غالبؔ کی سوسالہ برسی کی تقریب کے تعلق سے انھوں نے تقریباً تیس مقالے لکھے تھے۔ غالبؔ پر وہ ۱۹۳۴ء، ۱۹۳۵ء سے برابر لکھ رہے

ہیں۔علامہ اقبال پر انھوں نے پچاسوں مقالے لکھے ہیں۔مولانا ابوالکلام آزاد پر ان کے صرف مقالات کی تعداد ایک درجن سے زیادہ ہے۔ پھر یہ تو صرف ان شخصیات پر مقالات ہیں۔ان پر مستقل تصنیفات اور ان کے کلام،مکاتیب ،مقالات کی ترتیب کا کام جو ہزارہا صفحوں میں پھیلا ہوا ہے وہ اس میں شامل نہیں ہے،ان شخصیات پر انھوں نے جو کام کیا ہے اور وہ جس نوعیت و معیار کا ہے، اس پر الگ الگ مقالات لکھنے اور اس کام کا جایزہ لینے کی ضرورت ہے۔ غالبؔ اور اقبالؔ کے کلام کی شرحیں ان کا ادبی وتنقیدی کارنامہ ہے۔ان کے بعض مقالات تو مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتے ہیں۔

متفرق مقالات کے سلسلے میں دایرۂ معارف اسلامیہ لاہور میں مقالات نویسی کا ذکر ضروری ہے،اس میں ان کے مختلف شخصیات ،مقامات اور تاریخی موضوعات پر ستره مقالات شامل ہیں۔ ان کے پایۂ تحقیق اور معیارِ علمی کا اندازہ دایرۂ معارف اسلامیہ کے معیار سے لگایا جاسکتا ہے۔مولوی محمد شفیع مرحوم کے انتقال کے بعد جب تک ڈاکٹر سیّد محمد عبداللہ مرحوم نے دایرۃُ المعارف میں اپنی ذمے داریوں کو نہیں سنبھالا تھا ،اس کے تمام مقالات کی تصحیح اور ان پر نظر ثانی کا کام بھی ان کے ذمے تھا۔

ان کی بعض تصانیف اُردو ادب میں اپنی نوعیت اور معیار کے لحاظ سے کوئی نظیر نہیں رکھتیں۔مثلاً ''غالب'' اُردو میں پہلی کتاب تھی جس میں خود غالب کی تحریرات سے ان کے حالات کا استنباط کیا گیا تھا۔سید احمد شہید کی تحریکِ اصلاح و جہاد اور جماعتِ مجاہدین پر مولانا مہرؔ مرحوم کی کتابیں اُردو ادب کا نہایت بیش قیمت سرمایہ اور کمالِ تحقیق ،حُسنِ تصنیف وتالیف اور جامعیت کا عظیم الشان کارنامہ ہیں۔اسی طرح ۱۸۵۷ء کی تاریخِ استخلاص وطن اور مجاہدینِ آزادی کے سرفروشانہ کارناموں پر انھوں نے جو لکھا ہے وہ ادب اور تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔

مولانا مہرؔ صاحب اپنی زندگی کی آخری شام تک تصنیف وتالیف میں مصروف رہے۔زندگی کے آخری دنوں میں انھوں نے جو علمی کارنامہ انجام دیا وہ مولانا ابوالکلام آزاد کے مقالاتِ

سیرت کی ترتیب و تدوین ہے۔مہر صاحب کے کمالِ تدوین نے ان مقالات کو ایک مستقل تصنیف کے سانچے میں ڈھال دیا ہے۔ یہ تالیف "رسولِ رحمت" کے نام سے ان کی وفات کے بعد شائع ہوئی ہے۔اسی طرح انھوں نے سیرت انبیاے کرام کے موضوع پر مولانا کے مقالات بھی مرتب کر دیے جو "انبیاء کرام" کے نام سے شائع ہو گئے ہیں۔

ایک اور کام جو اُن کے پیشِ نظر تھا وہ مولانا آزاد پر ایک تصنیف تھی۔ جون ۱۹۷۱ء میں جب مولانا مہر صاحب سے آخری ملاقاتیں ہوئیں تو راقم الحروف نے انھیں اس کام پر آمادہ کر لیا تھا۔ اور پھر مرحوم آغا شورش کاشمیری کی معیت میں ان سے ملاقات میں ان کے ارادے کو مستحکم کر دیا تھا۔ اور بعض تحریرات جو ان کے سامنے نہیں تھیں انھیں مہیا کر دی تھیں۔ افسوس کہ اس کتاب کے صرف ساڑھے پانچ باب لکھے گئے تھے کہ حکمِ سفر آ پہنچا اور ۱۶ نومبر ۱۹۷۱ء کو وہ سفرِ آخرت پر روانہ ہو گئے۔

مہر صاحب کے انتقال سے ملک ایک نامور مورخ، عظیم صحافی، صاحبِ طرز انشاپرداز اور اُردو فارسی کے اچھے شاعر سے محروم ہو گیا۔ وہ بلند پایے کے مصنف ہونے کے علاوہ نہایت راسخ العقیدہ، بڑے متقی، پابند صوم وصلوٰۃ، شعائر اسلام کا احترام اور شریعت حقّہ کی پاس داری اور اس پر عمل کرنے والے، پاک طینت اور پاکیزہ سیرت شخص تھے اور اسلامی اخلاق وتہذیب اور قدیم وضع داری کا مجسمہ تھے۔

اس پایے کی اور ایسی جامع شخصیت سیکڑوں برس کی سیر و گردش کے بعد مطلع عالم پر نمودار ہوتی ہے اور ایک عالم کو منور کرنے کے بعد جب ان کا آفتابِ علم و فضل نگاہوں سے چھپ جاتا ہے تو پھر مدت تک اس پایے کی کسی اور شخصیت کے نظارۂ جمال کے لیے دُنیا کو انتظار کرنا پڑتا ہے۔

مولانا غلام رسول مہر نے بیرونِ ملک متعدد سفر کیے جو اپنی بعض یادگاروں کی بنا پر تاریخی اہمیت کے حامل ہیں۔ سب سے پہلا سفر انھوں نے ۱۹۲۵ء میں مجلسِ خلافت کے وفد کے ساتھ حجاز کا کیا۔ یہ وہی وفد خلافت ہے جس کے ایک رکن مولانا ظفر علی خاں تھے۔ یہ سفر

انھوں نے مولانا ظفر علی خاں کے سیکرٹری کی حیثیت سے کیا تھا۔ دوسرا سفر حجاز انھوں نے سلطان عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن کی دعوت پر ۱۹۳۰ء میں کیا۔ پیش نظر کتاب اُسی سفر کی دلچسپ روداد ہے۔ تیسرا سفر انھوں نے یورپ اور افریقہ کے کئی ممالک کا کیا۔ یہ وہ موقع تھا جب لندن میں دوسری گول میز کانفرنس اور بیت المقدس میں موتمر اسلامی کا اجلاس ہونے والا تھا۔ مہر صاحب اس سفر کے لیے یکم ستمبر ۱۹۳۱ء کو لاہور سے روانہ ہوئے اور روم، میلان اور پیرس میں ٹھہرتے ہوئے یکم اکتوبر کو لندن پہنچے۔ وہاں علامہ اقبالؒ مرحوم کا ساتھ ہوگیا۔ کانفرنس سے فارغ ہونے کے بعد مہر صاحب اور علامہ اقبال روم، نیپلز، اسکندریہ اور قاہرہ ہوتے ہوئے بیت المقدس پہنچے۔ جہاں مفتی اعظم فلسطین علامہ امین الحسینی کی صدارت میں موتمر عالم اسلام کا اجلاس ہو رہا تھا۔ اس اجلاس میں دونوں حضرات نے شرکت کی۔ اس سے فارغ ہوکر ۳۰ دسمبر ۱۹۳۱ء کو دونوں حضرات لاہور واپس پہنچ گئے۔ مہر صاحب نے اس سفر کی نہایت دلچسپ، معلومات سے پُر اور مفید روداد بھی لکھی جو اسی زمانے میں انقلاب میں شائع ہوئی۔ اس سے علامہ اقبالؒ کے متعلق سفر کے حالات وتفصیلات اخذ کر کے ''سفرنامۂ اقبال'' کے نام سے ایک کتاب محمد حمزہ فاروقی نے مرتب کر کے چھاپ دی ہے جو نہ صرف اقبال مرحوم بلکہ مولانا مہر کے بارے میں بھی نہایت مفید معلومات پر مشتمل ہے

۱۹۳۴ء میں انھیں کابل، غزنی اور قندھار کے سفر کا اتفاق ہوا۔ یہ ان کا بیرون ملک کا چوتھا سفر تھا۔ اس سفر کے موقعے پر اُن سے مولانا بشیر شہید امیر جماعت مجاہدینؒ نے تحریک جہاد اور سید احمد شہید کی سیرت اور ان کی خدمات پر کتاب لکھنے کا وعدہ لیا تھا جس کے نتیجے میں ''سید احمد شہید''، ''جماعت مجاہدین'' اور ''سرگزشت مجاہدین'' ظہور میں آئیں۔ اسی موقع پر انھوں نے شمال مغربی علاقے، بونیر، سوات، خدوخیل وغیرہ مقامات دیکھے جن کا تذکرہ سید احمد شہید کی تحریک جہاد کے سلسلے میں کثرت سے آتا ہے۔

قیام پاکستان کے بعد ہندستان بھی ایک غیر ملک ہوگیا تھا۔ اس لیے ہندستان کا سفر اندرونِ ملک کے سفر کی طرح نہ تھا۔ میرے علم کے مطابق مہر صاحب نے ہندستان کے تین

سفر کیے۔ ایک مرتبہ ڈھاکہ میں صحافیوں کی کانفرنس میں شرکت کے بعد دہلی ہوتے ہوئے واپس آئے اور دو مرتبہ "سید احمد شہید" کی تالیف کے سلسلے میں کتب خانہ ٹونک کی بعض کتابوں اور مخطوطوں سے استفادے کی غرض سے دہلی کا سفر کیا۔ اس لیے کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے مطلوبہ کتابیں ٹونک سے دہلی منگوالی تھیں۔ مہر صاحب نے مولانا کی کوٹھی میں قیام کر کے ان کتابوں اور مخطوطوں سے استفادہ کیا۔

نامناسب نہ ہوگا کہ چند سطروں میں زیرِ نظر سفرنامۂ حجاز کے بعض خصایص کی طرف بھی اشارہ کر دیا جائے۔

مولانا مہر کا یہ سفرنامہ نہ صرف علمی حیثیت سے بلکہ ادبی حیثیت سے بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ سفرنامہ مراحل سفر کی تفصیلات، منزل شوق کے تاریخی حالات، آداب و مقصدِ سفر اور مناسک حج کے سلسلے میں نہایت بیش قیمت اور اہم معلومات پر مشتمل ہے۔ یوں تو ان کی تمام تحریریں استدلال کی پختگی اور مضمون کے کمال ترتیب و تہذیب کے عدیم المثال نمونے ہیں۔ ماضی کے تذکار ہوں، خواہ تاریخ و تعلیم و تہذیب کا کوئی موضوع ہو، خواہ وقت کے مسائل و مباحثِ سیاست ہوں، ان کے فکر کی بلندی، طرزِ نگارش کی ندرت اور بیان کی شگفتگی کے ساتھ طنز و مزاح کی چاشنی ایک عجیب لطف دیتی ہے۔ لیکن ان کی تحریر کی یہ تمام خوبیاں جو اُن کی مختلف تحریروں میں پائی جاتی ہیں، اس سفرنامے میں یک جا دیکھی جا سکتی ہیں۔ اس کا علمی انداز کہ ہر بات مدلّل و مبرہن، اس میں رپورتاژ کی خوبی کہ ٹک دیکھ لیا دل شاد کیا اور چل نکلے، زبان کی صحت کہ مستند ہے میرا فرمایا ہوا، زبان کی لذت کہ دل اسی کا قصیدہ خواں ہے:

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے!

اسلوب کی رعنائی و دل ربائی کا عالم ہی جدا۔ ہر جملہ دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچتا ہے اور اپنی رنگینی و کرشمہ سازی کے نظارے کی دعوت دیتا ہے۔ کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا

ایں جاست۔کلام کی شیرینی کی یہ کیفیت کہ کمالِ نطق وحُسنِ بیان زبانِ قلم کے بار بار بوسے لیتا ہے۔

اس کی زبان میں آبشاروں کی نغمگی پائی جاتی ہے۔تحریر کی سلاست وروانی پر بادِ بہاری کے روح پرور جھونکوں کا دھوکا ہوتا ہے۔ اسلوب نگارش کی شگفتگی وتازگی میں سبزہ زاروں کی طراوت سمٹ آئی ہے۔سفر کے واقعات کا ایسا دلچسپ اور نظر فریب مرقع ،تاریخی و دینی معلومات کا ایسا خزانہ اور اسلوبِ نگارش کا ایسا حسین گلدستہ اُردو ادب میں بیش بہا اضافہ ہے۔اس میں افکار کی عطر بیزی بھی ہے اور بذلہ سنجی ومزاح نگاری کی ایسی لطیف اور بے نظیر مثالیں ہیں کہ بار بار پڑھنے اور سر دُھننے کو جی چاہتا ہے۔

قمر صاحب کا یہ سفر نامہ ان کے دوسرے سفرِ حجاز کی دلچسپ روداد پر مشتمل ہے۔ یہ سفرنامہ مکتوبات کی شکل میں ہے اور ہر مکتوب میں انھوں نے ایک مرحلہ سفر کی روداد مرتب کر دی ہے۔ اس لیے ہر مکتوب ایک باب کی حیثیت رکھتا ہے۔جن مکتوبات میں کسی مرحلے کے تمام تفصیلات سمانہیں سکی ہیں ،وہاں باب کو تبدیل نہیں کیا۔لیکن مکتوبات کو ایک دوسرے سے ممیز رکھنے اور مکتوب کی خصوصیت کو برقرار رکھنے کے لیے ان پر نمبر ڈال دیے ہیں۔

عرضِ حال

محنت کش مزدور نے دو ماہ کی غیر حاضری کے بعد اپنی محنت و مشقت کا کام پھر سنبھال لیا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ادائے فریضۂ حج کی سعادت نصیب ہوئی۔ ۱۹۲۸ء میں ارادہ کیا تھا مگر دوستوں اور محبوں نے کہا کہ مسلمانوں کے حقوق کا مسئلہ اضطراب کی حالت میں ہے بہتر یہ ہے کہ عزم حج کو آئندہ سال پر ملتوی رکھو۔ ۱۹۲۹ء کا حج آیا تو نہرو رپورٹ مسلمانوں کے لیے ایک مصیبت عظمیٰ بنی ہوئی تھی۔ اس سال حج کا موسم آیا تو کانگرس کی سول نافرمانی کے بادل ملکی فضا پر مسلط ہو رہے تھے۔ میں اب بھی بالکل متذبذب تھا۔ حتیٰ کہ ۷ار اپریل تک اپنے کسی عزیزی کو فیصلے کی اطلاع نہیں دے سکا تھا اور نہ قطعی فیصلہ کر سکا تھا۔ ۱۷ر اپریل کی رات کو لیٹے لیٹے غور وفکر کرنے لگا تو خیال آیا کی یہ مصیبتیں تو یونہی رہیں گی اور فرصت کا ایسا وقت کبھی بھی نصیب نہ ہوگا کہ ہر طرف اطمینان کی خوش گوار نسیم چل رہی ہو۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ ہر حال میں فریضہ حج ادا کیا جائے۔ ۱۸ر کی صبح کو میں نے اپنے یہ خیالات اپنے محترم و مشفق بھائی اور زندگی کے سب سے بڑے رفیق (سالک) کی خدمت میں پیش کر دیے۔ چند لمحوں میں آخری فیصلہ ہو گیا۔ بھائی نے اجازت دے دی۔ ضروری چیزیں فی الفور منگا دیں، عزیزوں کو تار دے دیے لیکن میں اس کے بعد بھی متذبذب تھا، سوچتا تھا کہ اگر خدانخواستہ حالات نے نازک صورت اختیار کر لی تو میرا بھائی تنہا کس طرح کام چلائے گا۔ اور اس کے ہمت شکن بوجھ میں اگر میرے گراں بہا بوجھ کا بھی اضافہ ہو گیا تو اسے کیسی مشکلات پیش آئیں گی۔ لیکن آخری فیصلے کے بعد میرے محترم

بھائی نے اصرار شروع کر دیا کہ اب اطمینان کے ساتھ چلے جاؤ اور باقی تمام افکار دل سے نکال ڈالو۔ ۲۰ر اپریل کی صبح کو میں اپنے بھائی کو اور "انقلاب" کو خدا کے سپرد کر کے روانہ ہو گیا۔ ۲۳ر کو خسرو جہاز میں کراچی سے روانہ ہوا تو اس کے ساتھ ہی ہندوستان پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ میں نے مکہ معظمہ پہنچ کر سارے حالات سنے تو اپنے بھائی کے لیے دُعا کے سوا اور کیا کر سکتا تھا۔ مصر و بیت المقدس جانے کا ارادہ تھا، اُسے ملتوی کیا اور ہندوستان چلا آیا۔ خدا کا شکر ہے کہ فریضۂ حج ادا ہو گیا۔ مجھے یقین ہے کہ اس کے ثواب میں سب سے بڑا حصہ دار میرا بھائی ہے جس کی شفقت سے مجھے اتنی مہلت مل گئی! اللہ تعالیٰ اس کی شفقت کو ہمیشہ مجھ پر سایہ فگن رکھے

مہر

۱۵ر جون ۱۹۳۰ء

باب اوّل

لاہور سے کراچی

کراچی ۲۱/اپریل ۱۹۳۰ء

بھائی السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

آپ سے اور دیگر احباب سے رخصت ہوا تو طبیعت بے اختیار بھر آئی۔ رخصتی معانقہ کے وقت امیر احمد خاں اور عزیز کی اشک باریاں پاسِ ضبط اور وضع احتیاط کی قبا کے کئی بند کھول چکی تھیں۔ جس تنہائی کے تصور نے میرے ان دو عزیزوں کی آنکھوں کو آنسوؤں سے بھر دیا تھا، وہ مجھ پر طاری ہوگئی تو میں صبر نہ کر سکا۔ اسمٰعیل لاہور کے اسٹیشن سے ٹرین کے چلتے وقت دوسرے ڈبے میں جا بیٹھا تھا اور میں بالکل تنہا ہو گیا تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ اسماعیل کے لیے سفر بہ منزلہ حضر اور حضر بہ منزلہ سفر ہے۔ وہ مقیم ہو تو مسافرت کی اجنبیت اور مسافرت کا اضطرار اس کی حرکات سے ظاہر ہوتے رہتے ہیں لیکن جب مسافر بن جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کی وہ اپنی اصلی اور مستقل زندگی کے دامن میں پہنچ گیا ہے۔ اس کے لیے غربت وطن ہے اور وطن غربت! چنانچہ ٹرین کے روانہ ہوتے ہی اس نے مختلف ڈبوں میں اس طرح پھرنا شروع کیا جیسے امیر آدمی انتہائی اطمینان کے عالم میں اپنے بنگلے کے مختلف کمروں کے چکر لگایا کرتے ہیں۔ اس کا سارا سامان میرے پاس تھا لیکن بستر اُٹھا کر اس نے دوسرے کمرے میں رکھ لیا تھا۔ رائے ونڈ تک میں اپنے کمرے میں تنہا رہا۔ رائے ونڈ ٹرین ٹھہری، میں اترا تو اسماعیل اپنے نئے کمرے سے نکل کر خراماں خراماں میرے کمرے یا حقیقۃً اپنے کمرے کی طرف آتے ہوئے دکھائی دیے۔ میں نے فی الفور انھیں الٹی میٹم دے دیا کہ اگر اس طرح سیماب پائی جاری رہی تو میں راستے میں اُتر پڑوں گا۔ اور ثواب حج سے

محرومی کا الزام تمھاری گردن پر عائد کروں گا۔ ساتھ ہی منتیں بھی کیں۔ اسماعیل کو میری حالت پر رحم آ گیا اور وہ میرے کمرے میں بیٹھ گیا یعنی مستقلاً

حقے کی مصیبتیں:

اسماعیل اُمرتسر سے کھانا پکوالایا تھا، سب سے پہلے کھانے سے فراغت پالینے کی تجویز پر عمل ہوا، کھانا کھا چکے تو حقے کی طلب ہوئی۔ آپ کے زور اہتمام کی برکت سے دوسری اشیا کے علاوہ ایک مختصر ساحقہ بھی میرے سامانِ سفر میں شامل ہو گیا تھا۔ اور یہ محض آپ کے اہتمام اور دفتر انقلاب کے بہترین کارکنوں کے اہتمام کے نتائجِ حسنہ کی ایک روشن دلیل تھا۔ مگر بے عیب ذات خدا کی ہے۔ آپ کے مہتم بالشان انتظامات کی جو خرابیاں اور سخت ''دست سوز'' خرابیاں بھی حقے کی طلب کے سلسلے میں معلوم ہوئیں، انھیں اب کیا بیان کروں اگر اسماعیل کی رفاقت التوائے سفر کو اُدا کر سکتی اور جہاز بھی میرے التوا کا ساتھ دینے پر آمادہ ہو جاتا تو خدا شاہد ہے کہ منٹگمری یا خانیوال کے اسٹیشن پر اُتر کر واپس لاہور پہنچتا۔ انتظامی خرابیوں کی اصلاح کراتا اور اس سلسلے میں آپ کو رخصت کے لیے دوبارہ لاہور اسٹیشن آنے کی زحمت دیتا۔ جس بے نصیب کے پاس حقہ نہ ہو وہ بادلِ نخواستہ سگرٹوں پر گزارا کر سکتا ہے۔ اگر چہ یہ گزارا کتنا ہی ''لب سوز'' کتنا ہی آبلہ انگیز اور کیسا ہی بے کیف کیوں نہ ہو۔ لیکن اس شخص کے رنج و ضبط کا اندازہ کون کر سکتا ہے جس کے پاس حقہ موجود ہو، مضبوط و پائیدار چلم موجود ہو، تمباکو کا تھیلا موجود ہو مگر نہ کوئلے ہوں کہ آگ سُلگا سکے اور نہ دست پناہ، جو جسے عرف عام میں چمٹا کہتے ہیں۔ اسماعیل ٹرین میں گھر کا پکا ہوا کھانا کھلا سکتا تھا، میوے کھلا سکتا، مٹھائیاں کھلا سکتا تھا، برف کا پانی اور برف میں لگا سوڈا پلا سکتا تھا، جہاز اور ریل کی ٹکٹ لے کر دے سکتا تھا، غرض کہ ساری دنیا کی ذمہ داریاں اٹھا سکتا تھا، مگر حقے کے باب میں اس سے کسی امداد و اعانت کی توقع فضول تھی، آپ کو یاد ہو گا کہ جب وہ حج سے واپس آیا کرتا تھا تو مجھے اس کی جیب سے پیسے نکال کے سگرٹ خریدنے میں خاص لطف آیا کرتا تھا، آپ یہ سگرٹ ''بیادِ نجد و یارانِ نجد'' پیا کرتے تھے، وہ اب بھی سگرٹ

لے دینے پر آمادہ ہوسکتا تھا۔ مگر حقے کی تیاری میں میرا ہاتھ کیوں کر بٹا سکتا تھا؟ تاہم میں نے اس کی طرف ملتجیانہ نگاہوں سے دیکھا اور رخساروں پر التماس و لجاجت کے حلقے ڈال کر عرض کیا کہ بھائی کوئلوں کا کیا بندوبست کریں۔ گاڑی منٹگمری کے اسٹیشن پر ٹھہری ہوئی تھی چلم میرے ہاتھ میں تھی، میری زبان سے کوئلہ کا لفظ نکلا ہی تھا کہ اسماعیل نے ٹھیٹھ وہابیاں انداز میں لاحول فرمایا اور میں سہم کر خاموش ہو گیا۔ دو لمحوں کے بعد اضطرار کے عالم میں پھر امداد کی درخواست پیش کر دی۔ خدا معلوم اسماعیل کے دل میں کیا خیال آیا کہ وہ دفعتہً دروازہ کھول کر ڈبے سے باہر نکل گیا میں یہ سمجھ کر اس کے پیچھے اُتر پڑا کہ شاید کوئلوں کا انتظام کر دے لیکن وہ خاموش ادھر اُدھر ٹہلتا رہا۔ آخر میں نے ایک ہندو دکان دار کے روبرو آگ کی عرض داشت پیش کر دی۔ اس بے چارے نے پوریوں کچوریوں کی چھابڑی کندھے سے اتار کر میرے سامنے رکھ دی اور کہہ دیا کہ آگ بجھ چکی ہے ورنہ ضرور دے دیتا

گرد و غبار کا طوفان:

اتنے میں سگنل ڈاؤن ہوا اور ٹرین گرد و غبار کے طوفان اٹھاتی ہوئی بلکہ سواریوں کے سروں اور چہروں پر خاک ڈالتی ہوئی انتہائی تیزی کے ساتھ چل پڑی۔ میں نے پھر اپنے اور اسماعیل کے سامان پر متجسسانہ نگاہ ڈالی، دفعتہً اس بوری پر نظر پڑی جس میں متفرق سامان رکھا ہوا تھا، میں نے سوچا کہ اگر یہ بوری آج کام نہ آئی تو اور اسے کس دن کے لیے اُٹھا رکھا جائے گا؟ چنانچہ میں نے اسمٰعیل سے چاقو مانگا اور بوری کی گردن کا جھٹکا کرتے ہوئے ایک اچھا خاصا ٹکڑا کاٹ لیا۔ ٹکڑا چلم میں رکھ کر اسے دیا سلائی دکھائی۔ اب چنے کی کمی محسوس ہوئی۔ آٹھ دس منٹ تک ہاتھ جلا کر اور پھونکا پھانکی کر کے حقہ پینا شروع کر دیا، لیکن بوری کی آگ کوئلوں کی آگ کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ میں اسماعیل سے باتیں کرنے لگا۔ دو منٹ تک کوئی کش نہ لگایا۔ بعد ازاں دیکھا تو چلم ٹھنڈی ہو چکی تھی

مجھے پہلے سے معلوم تھا کہ کراچی کے سفر میں گرد و غبار کی کثرت کے باعث حلیے بگڑا کرتے ہیں۔ اس لائن پر کراچی تک ایک مرتبہ، کوئٹہ تک ایک مرتبہ اور ملتان وغیرہ تک کئی

مرتبہ سفر کر چکا تھا۔خانیوال میں اسمٰعیل کو اپنے ایک عزیز سے ملنے کا انتظار تھا۔ ٹرین خانیوال کے قریب پہنچی اور میں نے اسماعیل کی شکل دیکھی تو بے اختیار ہنسی آ گئی۔ اس لیے کہ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا کوئی سادھو ابھی ابھی رنگ بھبھوت رما کر آیا ہے۔ ٹائلٹ روم میں اپنی شکل آئینے میں دیکھی تو معلوم ہوا کسی بھلے مانس کے لیے پہچاننا بھی مشکل ہے

اسمٰعیل تو صبر کیے بیٹھا رہا لیکن میں نے جلد از جلد سر اور منہ دھویا اور باہر نکلا، اسماعیل کے عزیز سے باتیں ہوئیں۔ وہ تازہ میووں کی ٹوکری لے آئے تھے۔ ٹرین روانہ ہوئی تو ہم نے میوے کھانے شروع کر دیے، لیکن گرد و غبار کا جو تجربہ اب کے ہوا اس کا تصور بھی دل پر لرزہ طاری کر رہا ہے۔ ہمارے ڈبے کی تمام کھڑکیاں اور دروازے بند تھے لیکن دس پندرہ منٹ کے بعد صندوقوں، ٹرنکوں، کپڑوں اور سیٹوں پر بلا مبالغہ ایک ایک انچ کی تہہ جم جاتی تھی۔ میں علیحدگی سندھ کے سب سے بڑے اور سرگرم حامیوں میں سے ہوں لیکن اس سلسلے میں کراچی کو شمالی ہند کی مستقل بندرگاہ بنانے کے جو خیالات ظاہر کیے جا رہے ہیں' ان کا سخت مخالف بن گیا ہوں۔ کراچی مستقل بندرگاہ بنے، چشم روشن دل ماشاد لیکن لاہور سے کون کمبخت کراچی آنا اور خاک میں تلنا پسند کرے گا، میری رائے میں کراچی کو اُس وقت تک شمالی ہند کی مرکزی بندرگاہ بننے کا موقع نہیں مل سکتا جب تک لاہور و کراچی کے درمیان ریل کی لائن کے ساتھ ساتھ زمین پوری طرح آباد نہ ہو جائے یا جب تک ریلوے والے گرد و غبار کو ریل کے اندر آنے سے روکنے کا قابل اطمینان بندوبست نہ کر لیں۔ اسماعیل آرام سے بیٹھا رہا میں ہر دس منٹ بعد اُٹھتا ساری چیزوں کو صاف کرتا اور بیٹھ جاتا۔ یہ شغل دن بھر مسلسل جاری رہا۔ اگر بلدیات والے بھنگیوں کے لیے کوئی اسکول کھولنا چاہیں تو میں سمجھتا ہوں کہ کراچی میل میں کراچی سے لاہور تک کا سفر ''بساط ہوائے بھنگیت'' کے ہر تازہ وارد کو ماہران بھنگی بنا دینے کے لیے بالکل کافی ہوگا۔

سماسٹہ سے کراچی:

سماسٹہ پہنچ کر ہم نے اپنا ڈبہ ایک بھنگی سے صاف کروایا۔ تمام چیزیں جھڑوائیں۔ میں

نے ریلوے کے ایک بابو سے پوچھا کہ یہاں کوئلے مل جائیں گے یا نہیں اور اپنے حقے کی بے کسی کا مرثیہ سنایا اس بچارے کو میری اور میرے حقے کی حالت پر رحم آ گیا اور ایک چائے والے سے اس نے مجھے کوئی سیر بھر کوئلے مفت لے دیے۔ میں سمہ سٹہ سے کراچی تک اس بابو کو دعائیں دیتا رہا۔ اگر محکمہ ریلوے کے تمام ملازمین اتنے رحم دل بن جائیں تو خدا کی قسم ریل کا سفر بہشت کی حیثیت اختیار کر لے اور ساری دنیا سفر کو حضر پر ترجیح دینے لگے سماسٹہ پر حافظ محمد صدیق صاحب ملتانی، تاجر و میونسپل کمشنر دہلی نے (جو اپنے رفقا کے ساتھ حج کے لیے جا رہے ہیں اور ہمارے ہم سفر ہیں) اپنے آدمی کے ہاتھ ہمارے لیے تازہ میوے اور پیسٹری بھیج دی۔ ڈیرہ نواب اسٹیشن پر حافظ صاحب سگرٹوں کا ڈبہ لے کر ہمارے ڈبے کے سامنے آ گئے اور مجھے سگرٹ دیا، شام کے وقت پھر حافظ صاحب نے کچھ نمکین چیزیں کھانے کے لیے بھیج دیں۔ اسماعیل کو دہلی کا تازہ پان مل گیا ڈاکٹر مرزا امام الدین نے کہا کہ خان پور کے اسٹیشن پر بھنے ہوئے مرغ اور تیتر مل جایا کرتے ہیں ٹرین خان پور پہنچی تو اسمٰعیل نے مرغوں اور تیتروں کی تلاش شروع کر دی مگر بے سود۔ میں اسٹیشن پر چکر لگا رہا تھا کہ ایک شناسا مل گئے اور سیاسیات سے متعلق باتیں کرنے لگے۔ میں نے عرض کیا کہ خدا کو منظور ہوا تو واپسی پر باتیں کروں گا۔ اب ہم نے سونے کا فیصلہ کر لیا، اسماعیل اس ڈبے میں جانا چاہتا تھا جہاں اُس کا بستر رکھا ہوا تھا لیکن بہ اصرار اُسے روک لیا، آخر فیصلہ ہوا کہ بستر کھولے بغیر لیٹ جائیں، اسماعیل نے صبح اُٹھ کر مجھے بتایا کہ وہ ایک مرتبہ رات کے بارہ بجے کے قریب بیدار ہوا تھا، میں پونے چار بجے بیدار ہوا۔ رات بھر میں گرد و غبار سے جو حالت ہو چکی تھی وہ محتاج بیان نہیں۔ میں نے اٹھ کر سب سے پہلے ساری چیزیں صاف کیں پھر کپڑے بدلے غسل کیا نفل پڑھے، نماز ادا کی اور پانچ بجے اسماعیل کو جگایا۔ اس نے بھی فی الفور اٹھ کر سر دھویا، وضو کیا، نماز ادا کی اور پھر ہم باتیں کرنے لگے۔ اب ذرا ذرا روشنی ہو چکی تھی ایک اسٹیشن پر ٹرین ٹھہری تو مجھے پلیٹ فارم پر مولانا محمد صدیق کراچی والے نظر آئے لیکن خیال آیا کہ شاید میں نے غلطی کی ہو اور کسی اور

شخص کو مولانا محمد صدیق سمجھ لیا ہو اسماعیل سے ذکر کیا اور اس نے باہر جھانک کر دیکھا تو کہا کہ بے شک یہ مولانا ہیں۔ ہم دونوں اُترے مولانا سے ملے اُنھیں اپنے پاس لے آئے اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں ہم نے ان سے کراچی کی کیفیت سنی۔

نزولِ اجلال:

کراچی چھاؤنی کے اسٹیشن پر پہنچے تو عزیزی یوسف عبداللہ ہارون موٹر لے کر آئے ہوئے تھے۔ میں وہیں اُتر پڑا اسماعیل کے لیے سیٹھ حاجی عبداللہ ہارون کے ہاں ٹھہرنے کا انتظام تھا اور یوسف نے بہت اصرار بھی کیا مگر اسماعیل کو بہت سے حاجیوں کے ٹکٹوں وغیرہ کا انتظام درپیش تھا۔ اس لیے میں نے کہا کہ میں شام سے پہلے نہیں مل سکوں گا۔ میں سیٹھ صاحب کے بنگلے پر پہنچا، عزیزی محمود سے ملا، سعید سے ملا۔ سیٹھ صاحب باہر جانے کے لیے تیار تھے ان کی زیارت ہوگئی۔

میں نے نہا دھو کر کپڑے بدلے اور تھوڑی دیر میں یوسف اور محمود موٹر پر سوار ہو کر اسماعیل کے تعاقب میں نکل پڑے۔ جہاں جہاں اس کے ٹھہرنے کا انتظام ہو سکتا تھا دیکھا مگر کوئی پتا نہ ملا۔ ساڑھے بارہ بجے کے قریب جامعۂ اسلامیہ و یتیم خانہ حاجی سیٹھ عبداللہ ہارون کے پاس پہنچ گئے۔ اس لیے میں نے مدرسہ بھی دیکھ لیا، جس کے متعلق مفصل مضمون الگ لکھوں گا فرصت ملی تو آج شام تک، ورنہ انشاللہ جہاز پر سوار ہو کر، مایوس واپس آرہا تھا کہ راستے میں اسمٰعیل مل گیا مختصر سی گرم گفتاری کے بعد قرار پایا کہ پانچ بجے میں پنجاب سندھ ہوٹل میں پہنچوں اور پھر اکٹھے باہر جائیں، میں واپس آگیا۔ کھانا کھایا، آرام کیا۔ پانچ سوا پانچ بجے پھر یوسف اور میں موٹر پر نکلے اور پنجاب سندھ ہوٹل پہنچے لیکن معلوم ہوا کہ اسمٰعیل جب سے گیا ہے واپس نہیں آیا۔ دس پندرہ منٹ کے انتظار کے بعد ہم وہ مقام دیکھنے کے لیے چلے گئے جہاں سے لوگ نمک اٹھا اٹھا کر لا رہے تھے

نمک کا ذخیرہ:

مجھے بتایا گیا تھا کہ خدا کی قدرت سے وہاں نمک کا ایک وسیع ذخیرہ نکل آیا ہے۔ میں

نے اُس مقام کو دیکھا۔ ہزاروں آدمی وہاں جمع تھے، اکثر تماشا دیکھ رہے تھے، کچھ لوگ نمک اُٹھانے میں مصروف تھے لیکن کانگرس کے رضا کار نہیں بلکہ عام شہری لوگ۔ تقریباً ایک ایکڑ کا مثلث خطہ ہے جس پر سمندری نمک بچھا ہوا نظر آتا ہے۔ بلا شبہ وہاں سمندر کا پانی نہیں آسکتا اس لیے بڑا تعجب ہوتا ہے کہ نمک کا اتنا ذخیرہ کہاں سے آگیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ پرسوں (۱۹راپریل) کو لوگوں نے یہاں نمک دیکھا تھا اور اُسے اٹھانا شروع کر دیا تھا۔ ہزاروں آدمی بالٹیاں، کنستر اور برتن بھر بھر کر لے گئے۔ ۲۰راپریل کو بھی یہی کیفیت رہی ۲۱راپریل کو صاف نمک کا ذخیرہ ختم ہو چکا تھا لیکن اس کے نیچے کسی قدر میلے نمک کی ایک تہ لگی ہوئی تھی میں نے خود دیکھا کہ تقریباً دو انچ موٹی تہہ جمی ہوئی تھی، لوگ لوہے کی موٹی موٹی سلاخوں سے نمک کی سلیں نکال رہے تھے۔ شام کو کراچی میں جلوس بھی نکلا۔

وفائی صاحب نائب مدیر ''الوحید'' سے ملاقات ہوئی مختلف اشخاص سے معلوم ہوا کہ کراچی کے ہنگامے کے متعلق لاہور کے جرائد میں جو بیانات شائع ہوئے وہ بے حد مبالغہ پر مبنی تھے۔ شام کو مختلف اصحاب کی معیت میں سیٹھ صاحب سے ملنے کے لیے آگئے۔ ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔

کراچی ۲۲راپریل، کل شام ہی سے اسماعیل کا الٹی میٹم مل چکا تھا کہ کل حاجی کیمپ میں پہنچ کر ٹیکوں کا اور ٹکٹ کا انتظام کراؤ۔ میں صبح ساڑھے دس بجے کے قریب اسماعیل کے پاس گیا مگر وہاں سامان، سوائے اسمٰعیل کے آثار کے کچھ نہ تھا۔ وہاں سے حاجی کیمپ پہنچا۔ معلوم ہوا کہ وہ پھر شہر میں چلے گئے ہیں مولانا محمد صدیق بھی راستے میں مل گئے تھے، انھیں موٹر میں ساتھ بٹھایا اور ان کی راہ نمائی میں ڈاکٹر سعید کے ہاں پہنچا۔ معلوم ہوا کہ اسماعیل ٹیکے لگوا کر تشریف لے جا چکے ہیں۔ پھر ہوٹل میں، پھر عبدالغنی والوں کے، ہاں پھر حاجی کیمپ میں لیکن اسماعیل نہ ملا۔ چاروناچار وہیں بیٹھ گیا۔ ایک گھنٹے کے بعد آپ (اسماعیل) مسکراتے ہوئے تشریف لائے اور کہا کہ پھرتا ہوا آرہا ہوں۔ فی الفور ٹکٹوں کا انتظام کیا اور میں دو بجے کے قریب گھر چلا آیا۔

۲۳ر اپریل حاجی کیمپ میں اسماعیل کی شانِ کارکردگی ایک مستقل تحریر کی محتاج ہے۔
مجھے اب بہت اضطراب ہے۔ جہاز آج شام کو جارہا ہے میں صبح سے گیا ہوا چیزیں خریدتا خریدتا اب دو بجے کے قریب آیا ہوں اور کھانا کھا کر جہاز پر جارہا ہوں۔ کراچی میں سیٹھ حاجی عبداللہ ہارون کی مسافر نوازی اور عزیزی یوسف عبداللہ ہارون کی حددرجہ محبت و الفت نے دل پر جو گہرے نقوش بٹھا دیے ہیں، انھیں بھی آئندہ صحبت میں بیان کروں گا۔
محمود کو صبح مدرسے جانا تھا، مجھ سے نہ مل سکا لیکن محبت بھرا خط لکھ کر میرے سوٹ کیس میں رکھ گیا نیز دعوت دی کہ واپسی پر یہاں ٹھہرنا۔

دُعا کا محتاج

مہر

(انقلاب: ۲۹ر اپریل ۱۹۳۰ء ص ۳،۲)

باب دوم

کراچی سے جدہ

خسرو و جہاز (عدن و کراچی کے درمیان - عدن سے تقریباً ۴۰۰ میل کے فاصلے پر)
۲۷/اپریل ۱۹۳۰ء

جانِ برادر السلام علیکم ورحمۃ اللہ

ہمارا جہاز ۲۳/اپریل کی شام کو پورے سات بجے کراچی سے روانہ ہوا تھا۔ طلوع و غروب کے اعتبار سے آج چلے ہوئے پانچواں دن ہے۔ گھنٹوں کے اعتبار سے شام کے سات بجے پورے چار دن ہو جائیں گے۔ ارادہ یہ تھا کہ میں ۲۴/کی صبح سے تھوڑا تھوڑا لکھنا شروع کر دوں گا لیکن ابتدا میں طبیعت کسل مندی رہی۔ کل بعد دوپہر معدہ میں تکلیف وہ ثقل پیدا ہو گیا اور سر میں درد ہونے لگا۔ میں نے پہلے تھوڑا سا چورن کھایا، پھر حافظ محمد صدیق صاحب کے پاس سے جوارش کمونی اور سونف کھالی۔ نیز جنجر کی بوتل پی لی۔ شام کی چائے چھوڑی، رات کا کھانا چھوڑا۔ شب بھر ہلکی ہلکی سی حرارت رہی۔ صبح اٹھ کر فروٹ سالٹ پیا اب کہ دن کے گیارہ بجے ہیں، طبیعت صاف ہے اور خدا کے فضل سے اس قابل ہوا ہوں کہ حسبِ وعدہ حالاتِ سفر کے سلسلے کی ترتیب وتسوید کو جاری رکھ سکوں۔

ہم کل شام کو عدن کے پاس سے گزریں گے۔ وہاں ٹھہرنے کا کوئی امکان نہیں۔ اس لیے یہ خط ڈاک میں نہیں ڈالا جا سکے گا۔ کامران میں میری معلومات کے مطابق کوئی ایسا انتظام نہیں کہ خط آپ کے پاس بر وقت پہنچ سکے۔ لہٰذا اغلب یہی ہے کہ یہ خط جدّہ سے ڈاک میں ڈالا جائے گا لیکن میں چاہتا ہوں کہ ابھی اسے پورا کر دوں۔ آج سے بعد کے

حالات جدّہ پہنچنے کے دن جہاز پر مرتب کردوں گا۔ اس لیے ساحلِ جدّہ پر اُترنے کے بعد میرے لیے تا ادائے فریضۂ حج تحریر کی فرصت نکالنی مشکل ہو جائے گی۔

قیام کراچی:

میں نے گزشتہ خط میں کراچی کے حالات درج نہیں کیے تھے۔ حالاں کہ وہاں کے حاجی کیمپ کی کیفیت بے حد ضروری تھی۔ نیز دو تین روز کے قیام میں جو کچھ پیش آتا رہا، اسے بھی قلم بند کرنا لازمی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں ۲۰ / اپریل کو لاہور سے روانہ ہو کر ۲۱ / اپریل کی صبح کو کراچی پہنچا۔ دوران قیام کراچی میں تین مرتبہ حاجی کیمپ میں گیا۔ جاتے ہی سیدھے ہاتھ پر ایک چھوٹا سا مکان ہے جس میں کھانے پینے کی چیزیں ملتی ہیں۔ کراچی میں چائے پی جاتی ہے۔ اس لیے اس مکان میں جو بہ اعتبار استعمال ہوٹل ہے، اگرچہ لفظ ہوٹل کے عام دماغی تصور کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسے ہوٹل کہنا موزوں معلوم نہیں ہوتا۔ ہوٹل کے سامنے تھوڑی سی جگہ چھوڑ کر ایک مختصر سا حجرہ بنا ہوا ہے۔ جہاں ٹرنر ماریسن کمپنی کے جہازوں کے ٹکٹ ملتے ہیں۔ اس سے آگے چل کر نیز بائیں ہاتھ متعدد شیڈ بنے ہوئے ہیں۔ جنھیں کسی حد تک پردہ دار بنانے اور مکانیت کی شکل دینے کے لیے لکڑی کی جالیاں یا جنگلے لگا دیے گئے ہیں۔ ان میں حاجی ٹھہرتے ہیں۔ یہیں ان کے ٹیکے لگائے جاتے ہیں۔ اس کیمپ کی توسیع و اصلاح کی بے حد ضرورت ہے۔ ہوٹل اور ٹرنر ماریسن کمپنی کے ٹکٹ گھر کے درمیان جو تھوڑی سی کھلی جگہ ہے اس میں سایہ دار درخت لگے ہوئے ہیں۔ وہاں ایک دکان لگی رہتی ہے جس میں سفر حج کے متعلق چند چھوٹے چھوٹے رسالے، بحری سفر کے لیے سفوف اور دوسری چھوٹی چھوٹی ضروری چیزیں ملتی ہیں۔ اتفاقات ایسے پیش آئے کہ میں اس کیمپ کے پانی اور روشنی کے انتظام کی تفصیلی کیفیت معلوم نہ کر سکا۔ سیّد اسمٰعیل غزنوی جو اس سفر میں میرے راہ نما اور رفیق تھے۔ حاجیوں کو ٹکٹ لے کر دینے میں اس درجہ مصروف تھے کہ ان سے بات کرنی بھی مشکل تھی۔

حاجی کیمپ:

میں پہلے دن کیمپ میں گیا تو یوسف عبداللہ ہارون اور محمود عبداللہ ہارون میرے ساتھ

تھے۔راستے میں مولانا محمد صدیق کراچی والے مل گئے تھے وہ بھی اسمٰعیل غزنوی کی تلاش میں جارہے تھے۔ ہم نے انھیں بھی موٹر میں اپنے ساتھ بٹھا لیا۔کیمپ میں پہنچے تو معلوم ہوا کہ اسمٰعیل صبح وہاں آئے تھے لیکن پھر شہر چلے گئے۔مولانا محمد صدیق فرمانے لگے کہ وہ ٹیکہ لگوانے کے لیے ڈاکٹر سعید کے پاس گئے ہوں گے۔ چنانچہ ہم موٹر لے کر ڈاکٹر سعید صاحب کی دکان پر پہنچے۔ وہاں سے معلوم ہوا کہ اسماعیل ٹیکہ لگوا کر آدھ گھنٹہ قبل جاچکے ہیں۔ڈاکٹر صاحب کی دکان سے ہم حاجی عبدالغنی صاحب صدر حج کمیٹی کی دکان پر پہنچے وہاں بھی اسمٰعیل نہ ملے۔ پھر پنجاب سندھ ہوٹل میں گئے۔ وہاں بھی مایوسی ہمارے استقبال کے لیے تیار تھی۔ ناچار مایوس ہو کر کیمپ میں آگئے۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ اسمٰعیل آدھ گھنٹے میں آئیں گے۔ اس لیے ہم ہوٹل میں بیٹھ گئے۔مولانا محمد صدیق چائے پیتے رہے۔ ہم نے برف والے پانی پر اکتفا کیا۔ میری ایڈیٹری کی رسوائی ہر جگہ میرے تعاقب میں تھی۔ چنانچہ ہوٹل میں بھی علیک سلیک کے بعد مختلف اصحاب آگئے اور وہی سیاسی باتیں ہونے لگیں، جن سے میں اپنے خیال کے مطابق لاہور ہی میں ایک خاص مُدت کے لیے قطع علائق کر چکا تھا۔لیکن میں ان باتوں کی تفصیل بیان نہیں کرسکتا اس لیے کہ خود ان میں شریک تھا اور ہوسکتا ہے میرا بیان میرے کسی دوست کے لیے تکلیف دہ بن جائے خواہ وہ کتنا ہی صحیح اور سچا کیوں نہ ہو۔

اسمٰعیل کی خدمات:

اسمٰعیل صاحب بارہ بجے کے قریب اپنے خاص انداز میں مسکراتے ہوئے تشریف لائے اور بڑی بے تکلفی سے فرمانے لگے کہ پھرتے پھرتے پریشان ہوگیا ہوں۔ گویا اُن کے سوا نہ کوئی پھرا اور نہ پریشان ہوا۔ بہر حال ٹکٹ خریدا۔ اس کے بعد اسمٰعیل نے مجھ سے کہہ دیا کہ ”تم جاؤ مجھے کام ہے“ وہیں طے پایا کہ صبح (۲۳ر اپریل کو) ضروری چیزیں خریدیں گے۔ میں تقریباً آدھ گھنٹے تک اسماعیل کے مشاغل کی کیفیت دیکھتا رہا۔ ان کے دونوں ہاتھوں میں نوٹ تھے۔ وہ خود بنچ پر بیٹھے تھے اور حاجیوں کا ہجوم انھیں گھیرے ہوئے

تھا۔ صبح کو مجھے معلوم ہوا کہ وہ بارہ بجے سے رات نو بجے تک حاجی کیمپ میں رہے اور حاجیوں کو ٹکٹ دلاتے رہے۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ انھوں نے کم وبیش پونے دو سو حاجیوں کو رعایتی ٹکٹ دلایا اور تقریباً دو سو آدمیوں کا انتظام وہ کراچی پہنچنے سے قبل تار کے ذریعے سے کر چکے تھے۔ ۲۱ر اپریل اور ۲۲ر اپریل کو وہ کلیتہً حاجیوں کے آرام وآسایش اور انتظامات کے لیے وقف رہے۔ ۲۳ر کی صبح کو دو گھنٹے تک ہمارے ساتھ چیزیں خریدتے رہے۔ اس لیے نہیں کہ ہمارے رفیقِ سفر تھے، اس لیے نہیں کہ ہمارے راہ نما تھے بلکہ اس لیے کہ ہم بھی عازم بیت اللہ تھے اور دوسرے حاجیوں کی طرح ہمیں بھی ان کی رفاقت اور معیت سے استفادے کا حق تھا۔ خدا شاہد ہے کہ دل پر اسمٰعیل کی اس نیک ومبارک کوشش کا بے حد اثر ہوا۔ یقیناً ان کا وجود عازمینِ حج کے لیے آیۂ رحمت ہے۔ شاید ہی کوئی حاجی ہو جس نے اسمٰعیل کی وساطت سے ٹکٹ لیا ہو اور اسے اچھی مالی رعایت نہ مل گئی ہو۔ حاجی عبدالغنی صاحب صدر حج کمیٹی کو ان ایام میں کلیتہً مصروف پایا۔ وہ بھی خدمتِ حجاج میں وقف رہے اور ان کے لیے ٹکٹوں کا انتظام کرتے رہے۔ ۲۳ر اپریل کو دوپہر کے وقت ہم ضروری سامان خرید کر پنجاب سندھ ہوٹل میں واپس پہنچے تو اس وقت بھی دو آدمی آ گئے اور اسماعیل سے ٹکٹ کی درخواست کرنے لگے۔ اسمٰعیل نے انھیں اپنا رقعہ دے دیا۔ شام کو جہاز پر سوار ہوتے وقت معلوم ہوا کہ انھیں بھی ٹکٹ مل گئے ہیں۔ میری زبان سے اسماعیل کی تعریف زیبا معلوم نہیں ہوتی۔ وہ میرا بھائی ہے، مدت کا رفیق ہے اور میری تعریف کو ذاتی تعلقات کی بنا پر میرے محبت آمیز جذبات کا نتیجہ سمجھا جا سکتا ہے لیکن حقیقت بہ ہر حال حقیقت ہے۔ میرے ساتھ جو حاجی جا رہے ہیں ان میں سے کثیر تعداد کی زبان سے اسمٰعیل کے لیے دُعائیں نکل رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُسے خوش رکھے اور اس کی ان مخلصانہ خدمات کو مسلمانوں کے زیادہ وسیع طبقے کے لیے مفید وسودمند بنائے۔ آمین

سیاسی گفتگوئیں:

میں عرض کر چکا ہوں کہ جس روز نمک کا تماشہ دیکھنے کے لیے گیا تھا اُس روز بعض

دیرینہ شناسا مجھے مل گئے تھے، جو اب نہایت پکے کانگریسی بنے ہوئے ہیں اور انھیں "انقلاب" کی رائے سے اختلاف ہے، مجھ سے ملے تو کہنے لگے کہ "آخر کار تم بھی یہاں پہنچ گئے۔" میں نے عرض کیا کہ مجھ جیسے سیکڑوں تماشائی یہاں موجود ہیں، وہ کہنے لگے کہ تمھاری باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں، میں نے کہا اگرچہ میں ہندوستان سے باہر جا رہا ہوں اور میرے پاس وقت نہیں، تاہم اس بات کے لیے تیار ہوں کہ جو کچھ آپ کی سمجھ میں نہیں آیا وہ آپ مجھ سے اس قلیل فرصت میں سمجھ لیں جو مجھے میسر ہے۔ گفتگو کے بعد طے پایا کہ میں ۲۳ر اپریل کو تین بجے ان سے ملوں، میں نے حاجی کیمپ سے واپس آتے ہی کھانا کھایا۔ تھوڑی دیر آرام کیا۔ پھر موٹر میں بیٹھ کر اُن احباب سے ملنے چلا گیا۔ کم و بیش تین گھنٹے تک باتیں ہوئیں۔ جیسا کہ پہلے کہہ چکا ہوں میں کسی ایسی سیاسی بحث کے متعلق کوئی بیان نہ دوں گا جس میں خود شریک رہا ہوں۔ میں اپنے ان بھائیوں کا ممنون ہوں، جنھوں نے مجھ سے باتیں کیں اور میری ناچیز گزارشات کو انتہائی توجہ سے سنا۔ دو ڈھائی گھنٹے کی گفتگو کے بعد انھوں نے یہ بھی کہا کہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی جب ڈاکٹر عالم کے ساتھ کراچی آئے تھے تو انھوں نے سیٹھ میر محمد بلوچ کے ہاں دعوت میں کہا تھا "مہر بُری بلا ہے" میں نے ادب کے ساتھ عرض کیا کہ یہ مولانا کا حُسنِ ظن ہے۔ میرے کراچی والے دوستوں نے یہ بھی کہا کہ مذکورہ بالا الفاظ سے مولانا حبیب الرحمٰن کا مقصد یہ تھا کہ وہ لیاقت و قابلیت کا اعتراف فرمائیں۔ لیکن میں نے اپنے بھائیوں سے عرض کر دیا کہ میں حد درجہ نا قابل و نا اہل ہوں، مجھ میں اگر کوئی قابلیت ہے تو محض یہ ہے کہ مسلمانوں کے جائز فائدے اور منفعت کی باتوں کو بے تکلفی کے ساتھ پیش کر دیتا ہوں اور بس!

اس صحبت سے فارغ ہو کر میں عزیزی یوسف کے ہمراہ کیماڑی چلا گیا۔ نئی گودی دیکھی جو اس وقت زیر تعمیر ہے۔ پُرانی گودی میں گئے وہاں خسرو جہاز آچکا تھا اور ہم جہاز دیکھ کر رات ۹ بجے کے قریب واپس آگئے۔ ۲۲ر اپریل کو میرے محترم بھائی عثمان صاحب تشریف لے آئے جن کے والد بزرگوار کا کاروبار بہت وسیع تھا مگر مولانا عبید اللہ سندھی ناظم نظارۃ

المعارف کے زرد لفافوں والے قصے میں ان پر حکومت کی توجہ مبذول ہوئی، کچھ مدت کے بعد عثمان صاحب اپنا کاروبار چھوڑ کر کراچی میں آ گئے اور مدت سے یہیں مقیم ہیں۔ ان سے بڑی دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ سیٹھ عبداللہ ہارون اس شام کو کسی ڈنر پر مدعو تھے۔ گیارہ بجے کے قریب سیٹھ صاحب ڈنر سے واپس آئے تو وہ بھی ہمارے پاس بیٹھ گئے اور تقریباً ایک بجے تک مختلف مسائل پر گفتگو جاری رہی۔

کراچی کے محترم میزبان:

۲۳؍کو ایک بجے کے قریب میں نے کھانا کھایا۔ سامان گاڑی میں جہاز پر بھیج دیا گیا۔ ڈھائی بجے میں خود نکلا۔ یوسف صاحب ساتھ تھے محمود صاحب صبح مجھ سے مل نہ سکے تھے کیوں کہ وہ جلد باہر چلے گئے تھے۔ اس لیے اسکول جاتے وقت ایک محبت بھرا رقعہ میرے سوٹ کیس میں رکھ گئے جس میں تاکید تھی کہ واپسی پر کراچی اُترو اور یہاں ٹھہرو۔ میں روانہ ہونے لگا تو یوسف صاحب آئے اور کہنے لگے کہ والدہ صاحبہ سلام کہتی ہیں اور فرماتی ہیں کہ آپ کے قیام کے دوران میں آپ کی کوئی تواضع نہیں ہو سکی معاف فرمائیے

سیٹھ عبداللہ ہارون کے خاندان کے اس حُسنِ اخلاق کا اثر تازیست میرے قلب پر تازہ رہے گا۔ تین روز کے قیام میں مجھے سیٹھ صاحب کے مکان پر ہر ممکن آسایش و راحت ملی۔ ایسی راحت و آسایش جو میرے معیارِ زندگی سے بدرجہا بڑھی ہوئی تھی۔ ایک موٹر میرے لیے وقف رہی۔ عزیزی یوسف اور عزیزی محمود ہر وقت میرے ساتھ رہے اور یوسف نے تو جہاز کی روانگی سے چند منٹ پیشتر تک ساتھ نہ چھوڑا لیکن ان نوازشوں اور ضیافتوں کے باوجود پیغام بھیجا گیا کہ خاطر تواضع نہیں ہو سکی۔ میں بے حد متاثر ہوا اور یوسف سے کہا کہ حضرت والدہ ماجدہ سے عرض کیجیے کہ میرے پاس ان کی نوازشوں اور عنایتوں کے شکریے کے لیے الفاظ نہیں۔ وہ میرے لیے خیر و برکت کی دُعا فرمائیں۔

گودی کے قرنطینہ میں:

میں ڈھائی بجے کے قریب کوٹھی سے روانہ ہوا اور تار گھر سے ہوتا ہوا تین بجے پنجاب

سندھ ہوٹل میں پہنچ گیا۔ وہاں سے اسماعیل اور ڈپٹی محمد شریف صاحب کو ساتھ لیا۔ مولانا محمد صدیق کراچی والے ہمارے ساتھ تھے۔ سامان ہم سے پہلے جہاز پر پہنچ چکا تھا جو چھوٹی چھوٹی چیزیں ہمارے ساتھ تھیں انھیں جہاز کے قلیوں کے حوالے کیا اور ہم قرنطینہ میں چلے گئے۔ اس لیے کہ ڈاکٹر سے تصدیقی پروانہ لیے بغیر جہاز پر جانا ناممکن تھا۔

جہاز پر جانے کی تیاری:

تصدیق ہمیں جاتے ہی مل گئی۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ اسے پہرہ داروں کے حوالے کر کے چلے جاتے تو پھر واپس آنا ناممکن تھا۔ مجھے یہ طرزِ عمل بہت بُرا معلوم ہوا۔ جہاز پر یا تو جانے نہیں دیتے اور اگر سارے مراحل طے کر کے کوئی چلا جائے تو پھر اُترنے نہیں دیتے۔ میں تصدیق نامہ لے کر پھر بڑے ڈاکٹر کے پاس گیا جو یوسف کے دوست ہیں۔ ڈپٹی محمد شریف بھی میرے ساتھ تھے۔ ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ ہمیں وزیٹرس کا پاس دے دیا جائے تاکہ ہم سامان اپنے کیبن میں رکھ کر نیچے آجائیں اور اپنے دوستوں سے مل کر دوبارہ سوار ہوجائیں۔ وہیں محافظ حجاج سے ملاقات ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب نے ازراہِ عنایت ہمیں جہاز پر جانے اور سامان سنبھالنے کی اجازت دے دی۔

شروع میں میرا اور اسماعیل کا خیال تھا کہ ہم جہاز کے کپتان کے ساتھ کا کیبن لے لیں گے لیکن چونکہ حاجی عبدالغنی صاحب وہ کیبن حافظ محمد صدیق صاحب رئیس و میونسپل کمشنر کے لیے لے چکے تھے، اس لیے ہمیں دوسرے انتظام کی ضرورت پیش آئی۔ اسماعیل قرنطینہ میں پھرتے رہے۔ میں جہاز پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ صرف دو کیبن خالی ہیں۔ نمبر دس اور نمبر چار۔

کیبنوں کا مسئلہ:

میں نے نمبر چار کے کیبن کو ترجیح دی۔ اوّل اس لیے کہ جب پہلی مرتبہ حجاز گیا تھا تو کیبن نمبر چار میں گیا تھا اور واپس آتے وقت بھی مجھے وہی کیبن ملا تھا۔ اس لیے نمبر چار سے مجھے اُنس تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ پہلے جہانگیر جہاز کا کیبن نمبر چار تھا اب خسرو جہاز کا۔ دوسرے نمبر دس کیبن میں بقول نشتر صاحب ذم کا پہلو پیدا ہوتا تھا اور احتیاط کا تقاضا

یہی تھا کہ میں نمبر دس میں جانے سے احتراز کرتا۔ چنانچہ میں نے اپنا اور اسماعیل کا سامان نمبر چار میں رکھا اور ڈپٹی محمد شریف صاحب کے لیے کیبن نمبر پانچ میں ایک سیٹ کا انتظام ہو گیا۔ اس انتظام سے فارغ ہونے کے بعد میں جہاز سے اُترا۔ اترنے پر معلوم ہوا کہ میری چھتری اور چھڑی غائب ہے۔ چھڑی کا تو چنداں فکر نہ تھا مگر چھتری کی وجہ سے مجھے بہت اضطراب ہوا۔ تاہم اس وقت کوئی نیا بندوبست بظاہر غیر ممکن تھا

مجھے دوران قیام کراچی میں زیادہ افسوس اس بات کا رہا کہ شیخ عبدالمجید صاحب، سیٹھ میر محمد بلوچ اور حافظ شریف حسین صاحب سے باوجود کوشش کے نہیں مل سکا تھا۔ حافظ شریف حسین صاحب قرنطینہ کے باہر مل گئے۔ جہاز پر سوار ہوتے وقت دوبارہ ان سے ملاقات ہوگئی۔ بہت سے احباب اور اہل کراچی گودی میں پہنچ گئے تھے۔ میں سوا پانچ بجے کے قریب جہاز میں چلا گیا۔ وہاں پہنچا تو مجتبیٰ صاحب، ان کے بھائی، اور جامعہ اسلامیہ ویتیم خانہ سیٹھ عبداللہ ہارون کے پرنسپل ہمیں رخصت کرنے کے لیے آگئے۔ میں نے جہاز ہی میں انھیں سلام کیا۔ مزاج پُرسی کی۔ ساڑھے پانچ بجے حاجی سیٹھ عبداللہ ہارون جہاز پر آگئے۔ یوسف اس وقت تک جا چکے تھے۔ سیٹھ صاحب نے خان بہادر واحد بخش سے بعض دوسرے اصحاب سے ملاقات کرائی۔ اسماعیل کو حج کمیٹی کی رپورٹ دی اور ہمیں تاکید کی کہ دورانِ سفر میں ہم کمیٹی کی سفارشات کو مدِنظر رکھتے ہوئے ان کی اچھائی بُرائی نوٹ کرتے جائیں۔ چھ بجے کے قریب سیٹھ صاحب رخصت ہو کر چلے گئے۔ نانا بھائی صاحب جو ٹرنر ماریسن کمپنی کے ٹکٹوں کے انتظامی دفتر کے خاص آدمی ہیں اور اسماعیل کے بڑے دوست ہیں۔ اُن سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے ہمیں کپتان سے انٹروڈیوس کرایا۔ جب میری ایڈیٹری کا ذکر آیا تو کپتان صاحب نے ہنس کر کہا تم سب کچھ لکھتے جاؤ گے۔ تم سے ڈرنا چاہیے۔

جہاز کی روانگی:

سات بجنے میں کچھ منٹ باقی تھے کہ جہاز نے وہ مکروہ آواز نکالی جس کی سامعہ شگافی کا تذکرہ میں بار بار کر چکا ہوں۔ یہ روانگی کا ابتدائی اعلان تھا۔ حاجی عبدالغنی صاحب صدر کمیٹی، ڈاکٹر صاحب، ان کے رفیق، نانا بھائی اور محافظ حجاج اُتر گئے۔ سیڑھیاں اُٹھ

گئیں۔دوبارہ وسل ہوئی اور جہاز نے آہستہ آہستہ کنارے سے ہٹنا شروع کیا۔تقریباً دو ہزار افراد ساحل پر جمع ہوگئے تھے۔ انھوں نے اللہ اکبر کے نعرے لگائے۔ تھوڑی دیر میں جہاز جزیرہ منوڑا کے پاس سے گزرتا ہوا کھلے سمندر میں آ گیا۔ ہم نے روانگی کے ساتھ ہی بِسۡمِ اللّٰهِ مَجۡرٖهَا وَمُرۡسَاهَا إِنَّ رَبِّيۡ لَغَفُورٌ رَّحِيۡمٌ [1] کی قرآنی دُعا پڑھی اور کم وبیش چھ روز کے لیے خشکی سے ہی نہیں بلکہ منظر سے بھی محروم ہو گئے جب حاضرین ساحل آنکھوں سے اوجھل ہو گئے تو سب سے پہلے کھانے اور حقے کی فکر ہوئی۔ خدا کا شکر ہے کہ ان انتظامات کی اُلجھنوں سے جلد ہی فراغت مل گئی اور میں کم وبیش چار سال کے بعد جہاز کے کیبن میں سویا۔

رفقائے سفر:

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں سب سے پہلے اپنے رفقائے سفر کی مجمل سی کیفیت بیان کردوں ڈپٹی محمد شریف صاحب امرتسری کا نام آپ کو معلوم ہی ہے، جن کے لیے آپ نے ہمارے ساتھ سیٹ ریزور کرائی تھی۔ صاحب موصوف نہر کی ڈپٹی کلکٹری سے ریٹائر ہوئے ہیں۔بے حد شریف اور وضع دار بزرگ ہیں۔ پہلے لندن کا سفر کر چکے ہیں اب حج کے لیے تشریف لے جارہے ہیں۔

حافظ محمد صدیق صاحب ملتانی رئیس و میونسپل کمشنر دہلی بھی لاہور کے اسٹیشن پر آپ سے مل چکے ہیں۔حافظ صاحب دہلی کے بہت بڑے تاجر ہیں۔کلکتے میں بھی آپ کی دو دکانیں ہیں جن کی باگ آپ کے صاحبزادوں کے ہاتھ میں ہے۔آپ مسلمانوں کے تعمیری و تعلیمی کاموں سے خاص دل چسپی رکھتے ہیں۔ بے حد خوش اخلاق اور محبت والے بزرگ ہیں۔ دورانِ سفر میں ہمیں اُن کی وجہ سے بے حد آرام ملا۔

حافظ صاحب کے ساتھ جناب شمس الحق دہلوی چاند تارا خضاب والے بھی ہیں اور بعض اور اصحاب بھی۔ مثلاً حافظ صاحب کے دو عزیز شمس الاسلام صاحب اور قمر الاسلام صاحب

[1] سورہ ہود کی آیت نمبر ۴۱، اس پوری آیت کا ترجمہ یہ ہے: ''اور (نوح کے ساتھیوں سے) کہا: کشتی میں سوار ہو جاؤ اللہ کے نام سے اس کا چلنا ہے اور اللہ ہی کے نام سے اس کا ٹھہرنا ہے! بلاشبہ میرا پروردگار بخشنے والا رحمت کرنے والا ہے''

اور حاجی محمد دین صاحب جو حافظ صاحب کو چھوڑنے کے لیے کراچی آئے تھے، پہلے دو مرتبہ حج کر چکے ہیں۔ حافظ صاحب کے کہنے پر کراچی میں ازسرِ نو حج کا ارادہ کر لیا

کان پور کے حافظ فخر الدین کا نام بھی قابل ذکر ہے جو چوتھی مرتبہ حج کے لیے جا رہے ہیں۔ آپ لوہے کے تاجر ہیں اور آپ کے صاحبزادے نعیم الدین صاحب فہیم کا نیج والے ہمارے اخبار کے خریدار ہیں

شمس العلما مولانا سید احمد صاحب امام جامع مسجد دہلی بھی ہمارے ساتھ حج کے لیے تشریف لے جا رہے ہیں۔ امام صاحب کی نسبت مجھے کچھ عرض کرنے کی ضرورت نہیں۔ بمبئی کے سیٹھ عبدالشکور صالح محمد صاحب دہلی سے تشریف لائے ہیں۔ سیٹھ صاحب پارے کے بہت بڑے تاجر ہیں۔ ہندوستان کے تقریباً تمام بڑے بڑے شہروں سے آپ کا کاروباری تعلق ہے۔ اسمٰعیل گزشتہ سال مصر سے واپس آتے ہوئے ان سے جہاز پر ملے تھے، اور سفر ہی میں دونوں کے درمیان نہایت گہرے تعلقات پیدا ہو گئے تھے۔ سیٹھ صاحب کے حُسنِ اخلاق کے متعلق میں لاہور میں اسماعیل سے بہت سی باتیں سُن چکا تھا۔ میں پہلی مرتبہ تنہا جہاز پر آیا تو انھیں دیکھ کر قرائن سے مجھے معلوم ہو گیا کہ سیٹھ عبدالشکور یہی ہیں۔ میں سیٹھ صاحب کے متعلق اس سے زیادہ کچھ نہیں لکھ سکتا کہ اسماعیل سے باتیں سن کر جو تصور دماغ میں قائم ہوا تھا سیٹھ صاحب کو اس سے بہتر پایا۔

ہمارے ڈپٹی صاحب بہت کم گو اور زمانہ دیدہ آدمی ہیں۔ وہ کبھی کسی شخص کے متعلق جلد رائے زنی نہیں فرماتے لیکن کل سیٹھ صاحب کے متعلق فرمانے لگے کہ میں کبھی کسی کا مرید نہیں ہوا۔ اب جی چاہتا ہے کہ سیٹھ عبدالشکور صاحب کا مرید ہو جاؤں۔ اس لیے کہ یہ انسان کی شکل میں فرشتہ ہے۔ آگرے کے مشہور تاجر حاجی وارث علی صاحب کے صاحب زادے سیٹھ محمد یوسف بھی ہمارے رفیق ہیں۔ سیٹھ عبدالشکور کے ساتھ بمبئی کے سیٹھ ابراہیم کھنڈوانی اور سیٹھ محمد سلیمان بھی حج کے لیے جا رہے ہیں۔

بقیہ اصحاب:

لیجیے محبوب صدیقی بھی حاجیوں کی ایک جماعت کو لے کر اسی جہاز سے جا رہے

ہیں۔مسقط کے ایک تاجر مسقط سے کراچی گئے اور وہاں سے ہمارے ساتھ سوار ہوئے۔ بقیہ اصحاب میں سے بعض کے نام یہ ہیں۔ خان بہادر واحد بخش صاحب سابق وزیر خیر پور کے صاحب زادے صاحب جن کا نام یاد نہیں رہا، بہاول پور کے میر منشی صاحب ،حضرت میاں نذیر حسین صاحب مرحوم محدث دہلوی کے نبیرہ مولوی ابوالحسن صاحب ،امرتسر کے متعدد اصحاب ،ڈاکٹر ولی محمد صاحب بھوپالی ممبر کونسل آف اسٹیٹ بھوپال ومصنف ''سفر نامۂ اُندلس'' جو آٹھ سال سے اُندلس کی اسلامی تاریخ لکھنے میں مصروف ہیں۔ دومرتبہ ہسپانیہ کی سیاحت فرما چکے ہیں اب حج سے فارغ ہو کر تیونس ،الجزائر ،مراکش اور ہسپانیہ جانے کا ارادہ فرمارہے ہیں۔

بمبئی سے خسرو جہاز میں صرف ستاون حضرات سوار ہوئے تھے۔ کراچی سے سات سو چالیس اصحاب سوار ہوئے۔ ان میں ایرانی حاجیوں کی بھی ایک بڑی تعداد شامل ہے جن کے ساتھ ایرانی قالینوں کا خاصا ذخیرہ ہے اور کل سے ہر وقت قالینوں کی خرید وفروخت کا سلسلہ جہاز میں جاری ہے۔ ایرانی دو وقت جہاز میں ماتم کرتے ہیں۔ ڈونگر گڑھ (سی پی) کے ایک تاجر اپنے اہل وعیال سمیت حج کے لیے جارہے ہیں

جہاز کا دیسی ہوٹل:

جہاز میں کھانے کا دوہرا انتظام ہے۔ انگریزی کھانا اور دیسی کھانا۔ آپ کو معلوم ہے کہ دیسی کھانے کے انتظام میں مجلس مرکزیہ خلافت بھی شریک ہے۔ ہم نے دیسی کھانے کا انتظام کیا تھا۔ ۲۳راپریل کی شام سے کھانا کھانا شروع کیا اور ۲ر یا ۳رمئی کو جدہ پہنچ جائیں گے۔ ایک طرف کے سفر کے لیے فرسٹ کلاس کے کھانے کی قیمت علی الحساب ۲۵ روپے مقرر ہے۔ علیحدہ علیحدہ پکی ہوئی چیزیں بھی مقررہ قیمت پر مل جاتی ہیں۔ ہمیں کھانا کھاتے ہوئے آج پانچواں دن ہے۔ منیجر صاحب ہم پر بڑی توجہ مبذول فرماتے ہیں لیکن حق یہ ہے کہ پنجابیوں کے نقطۂ نگاہ سے کھانا اچھا نہیں ملتا۔ چیزیں اچھی ہیں مگر باورچی اچھے نہیں ہیں۔ لیکن ان کو مختلف صوبوں کے لوگوں کے مزاج کے مطابق کھانے کے انتظام کا کوئی سلیقہ نہیں ہے۔ ایک بڑی مصیبت یہ ہے کہ دیسی کھانا کھانے والوں کے لیے کھانے کی کوئی جگہ

نہیں ہے۔ گزرگاہ عام پر چٹائیاں ڈال دی جاتی ہیں جو چاہے وہاں بیٹھ کر کھائے یا کیبن میں منگا لے لیکن کیبن میں تو دو آدمیوں کا سامان رکھنے کے بعد بیٹھنے کے لیے کافی جگہ ہی باقی نہیں رہتی۔ ہم نے کوشش کی تھی کہ انگریزی ڈائننگ ہال میں کھانا کھانے کی اجازت مل جائے ،لیکن کپتان نے کہہ دیا کہ وہ اجازت نہیں دے سکتے۔ اس لیے کہ ڈائننگ ہال صرف جہاز کے افسروں کے لیے مختص ہے۔ صبح کے وقت اور عصر کے وقت چائے ملتی ہے اور دو وقت کھانا۔ کھانے میں عموماً دو سالن، چاول اور کوئی میٹھی چیز ہوتی ہے۔ اُبلا ہوا انڈا تین آنے کو ملتا ہے۔ سوڈے کی بوتل تین آنے کو ،لیمونیڈ کی بوتل چار آنے کو۔ دیسی ہوٹل کی روٹی سب سے زیادہ خراب ہے۔ میدے کی روٹی تھوڑا سا گھی لگا کر ولایتی چولھے پر پکاتے ہیں۔ پنجاب کے رہنے والے روٹی کی شکل دیکھ کر گھبرا جاتے ہیں کہ اسے روزانہ کھانے کے بعد دوسرے تیسرے روز بیمار نہ ہونا پڑے اور علاج کے لیے ایک وقت کا کھانا نہ چھوڑنا بالکل غیر ممکن ہے۔ چنانچہ میں پرسوں بیمار ہوا تھا۔ کل طبیعت ذرا اچھی رہی۔ آج پھر بیماری کے کنارے پر پہنچا ہوا ہوں۔ خدا معلوم کل کیا پیش آئے۔

ڈپٹی صاحب کی دعوت:

۲۵ر کی شام کو ڈپٹی محمد شریف صاحب نے بعض اصحاب کو دعوت دے دی۔ جس میں مندرجۂ ذیل اصحاب شریک ہوئے۔ مہر، اسماعیل ،عبدالشکور ،سیٹھ کھنڈوانی ،سیٹھ محمد سلیمان ، حافظ محمد صدیق صاحب دہلوی ، جناب شمس الحق صاحب ،جناب امام صاحب ، سیٹھ محمد یوسف صاحب ، امین الدین صاحب میر منشی بہاول پور ، مولوی ابوالحسن صاحب ،مولوی اشرف علی صاحب امرتسری ،مولوی محمد حسین صاحب امرتسری ، مولوی محمد حسن صاحب امرتسری۔ کپتان صاحب نے دعوت کے لیے بطور خاص ڈائننگ ہال کے استعمال کی اجازت دے دی اور بعد دعوت حاضرین نے ڈپٹی صاحب کا دلی شکریہ ادا کیا

سفرِ حج کی تکالیف:

اس وقت کے سفر کی کوئی بات قابل ذکر نہیں۔ میں نے پہلے سفر کیا تھا تو سارا جہاز سامان سے بھرا ہوا تھا۔ ہمارے سوا صرف ایک مسافر تھا۔ اس لیے سارے جہاز کو ہم اپنی

مرضی کے مطابق استعمال کرتے تھے، لیکن اب کم و بیش آٹھ سو مسافر ہیں جن میں سے کئی ہوا کی تلاش میں ڈیک پر پلنگ بچھائے یا بستر جمائے بیٹھے رہتے ہیں۔ بلکہ بعض فرسٹ کلاس کے کیبنوں کے سامنے کی گیلری میں بھی بستر جما لیتے ہیں۔ اس وجہ سے مجھ جیسے تنہائی پسند اور سکوں دوست آدمی کے لیے بحری سفر بجائے دل چسپ ہونے کے قدرے تکلیف دہ بن گیا ہے۔ لیکن چوں کہ سارے مسافر مسلمان ہیں اور عازمینِ حرمین شریفین ہیں۔ ہر لحظہ دعا، نماز، ذکر اور تلاوت کا مشغلہ جاری رہتا ہے سفر میں عبادت کا پہلو بہر حال غالب ہے، اس لیے طبیعت مطمئن ہے اور ہر لحظہ جی چاہتا ہے کہ کسی بھائی کو تکلیف ہو تو اس کی تخفیف کے لیے کوشش کی جائے۔ ساری دُنیا کو معلوم ہے کہ حاجیوں کے جہازوں میں تھرڈ کلاس کے مسافروں کے لیے قیام کا انتظام اچھا نہیں ہے۔ میں خود بھی اس کے خلاف مضمون لکھ چکا ہوں۔ لیکن اس انتظام کا تجربہ اس مرتبہ ہوا، میں تین چار مرتبہ نیچے کی منزلوں میں ہو آیا ہوں مجھے بتایا گیا ہے کہ اس جہاز میں چوں کہ معمول سے کم مسافر ہیں (یعنی آٹھ سو ہیں حال آں کہ عموماً پندرہ سو ہوتے ہیں) اس لیے تمام حاجیوں کو کافی جگہ مل گئی ہے، لیکن ان کے لیے ہوا کا کافی انتظام نہیں اور وہ جانوروں کی طرح بھر دیے جاتے ہیں۔ اگر موسم گرم نہ ہو تو سفر میں شاید زیادہ تکلیف نہ ہو۔ لیکن ہم جوں جوں بحر احمر کے قریب تر آ رہے تھے موسم گرم ہوتا چلا جا رہا ہے اور حاجیوں کی تکالیف بڑھ رہی ہیں۔ جہاز کا کپتان (کمانڈر بیٹی) بے حد شریف ہے۔ ہر معاملے پر فی الفور توجہ کرتا ہے۔ حاجیوں کو ہر ممکن آرام پہنچانے کے لیے ساعی رہتا ہے لیکن وہ جہاز کی وضع و ساخت کو بدلنے سے قاصر ہے۔ اور جن کوٹھڑیوں میں بوریاں بھری جاتی ہیں ان میں آدمیوں کو کبھی وہ آرام نہیں مل سکتا جس کے وہ قطعی طور پر مستحق ہیں۔ (انقلاب: ۲۹ مئی ۱۹۳۰ء ص ۲، ۳)

ہمارا روزانہ معمول:

خود ہماری یہ حالت ہے کہ صبح اٹھ کر نماز ادا کرتے ہیں۔ حافظ محمد صدیق کے پاس بالائی منزل میں پہنچ جاتے ہیں۔ اکثر چائے بھی ان کے ساتھ پیتے ہیں ان کے ساتھ چوں کہ ملازم ہے۔ نیز ان کے تمام رفقا حافظ صاحب کو آرام پہنچانے میں ساعی رہتے ہیں۔

اس لیے میں نے حقہ تمباکو ان کے کیبن میں پہنچا دیا ہے۔علی الصبح حقہ تیار مل جاتا ہے۔ دو پہر کو کھانے کے وقت نیچے آتے ہیں، کھانا کھا کر اپنے کیبن میں سو جاتے ہیں، اُٹھ کر نماز ادا کرتے ہیں پھر اوپر چلے جاتے ہیں۔ مغرب کی نماز ہم سب مل کر امام صاحب جامع مسجد دہلی کے پیچھے ادا کرتے ہیں۔ اس کے بعد پھر کھانے کے لیے نیچے آجاتے ہیں۔ جب کھانے سے فارغ ہو جاتے ہیں تو دوبارہ اُوپر چلے جاتے ہیں۔ اور رات کے دس بجے تک اور بعض اوقات بارہ بجے تک آرام کرسیوں پر لیٹے رہتے ہیں۔ حافظ صاحب کے پاس ہر قسم کا سامان بکثرت موجود ہے۔ ایک روز میرے سر میں درد تھا تو آپ نے ایک نہایت عُمدہ تیل ایک خوبصورت شیشی میں ڈال کر مجھے عنایت فرمایا۔ میری طبیعت خراب ہوئی تو جوارش کمونی کھلائی۔ کل سے روزانہ شام کو لیمن اسکولیش پلاتے ہیں۔ کل دوپہر ہمارے لیے مُرغ پلاؤ اور سالن بھیجا تھا۔ دو تین مرتبہ عمدہ پیسٹری اور دوسری لذیذ چیزیں عنایت فرما چکے ہیں۔ اسمٰعیل کو پان بھی مل جاتا ہے۔ میں اس نعمت سے محروم ہوں۔ اس لیے کہ آپ جانتے ہیں کہ میں نے کئی مہینے سے پان چھوڑ رکھا ہے۔

منظر کی غیر دل چسپ یکسانی:

چار روز تک طبیعت بہت مضطرب رہی۔ پانچ سمت پانی اور اُوپر آسمان تھا۔ اس منظر میں بال برابر بھی تغیر پیدا نہ ہوا۔ میں نے ایک روز گھبرا کر کہا کہ خدا کرے سمندر میں طوفان آجائے تاکہ کچھ تو تبدیلی رُونما ہو۔ پرسوں شام کے وقت کوریا موریا کے جزیرے نظر آئے۔ اس کے بعد پھر وہی پُرانا ،فرسودہ اذیت افزا منظر پانی ہی پانی۔ آج دو بجے کے قریب عرب کے خشک اور جھلسے ہوئے پہاڑ نظر آئے۔ سنتے ہیں کہ کل ۲۹/اپریل کو ایک بجے کے قریب عدن کے پاس سے گزریں گے۔ پرسوں ۳۰/اپریل کو ایک دو بجے کے قریب کامران کے ساحل پر لنگر انداز ہو جائیں گے۔ جو حاجی کراچی سے سوار ہوئے تھے وہ سب چیچک اور ہیضے کے ٹیکے لگوا چکے تھے لیکن بمبئی والے ستاون حاجی بالکل صاف آئے تھے۔ اگر وہ بھی ٹیکے لگوا کر آتے تو ہمیں کامران جانے اور ٹھہرنے کی ضرورت نہ پڑتی۔ اب ان ستاون اصحاب کے ''گناہ'' کی پاداش میں ہمیں بھی سزا بھگتنی پڑے گی لیکن آج نائب کپتان

سے معلوم ہوا کہ کامران میں صرف بمبئی والے ستاون اصحاب ہی کو اتار کر بھپارہ دیا جائے گا۔ جب تک ہندوستانی مسلمان پُرزور جدوجہد نہ کریں، کامران کی بلا سر سے نہیں ٹلے گی۔ اگر سارے حاجی چیچک اور ہیضے کے ٹیکے لگوا لیا کریں تو کامران میں ٹھہرنے کا سلسلہ بالکل ہی بند ہو جائے

۳۰؍اپریل ۱۹۳۰ء بحیرۂ قلزم (کامران سے تقریباً پانچ گھنٹے کی مسافت پر)

کامران کا اضطراب زاقرب:

سُنا جاتا ہے کہ آج ایک بجے کے قریب کامران پہنچ جائیں گے لیکن نہیں کہا جاسکتا کہ وہاں ہمارے ساتھ کیا سلوک ہوگا۔ جو لوگ کراچی سے سوار ہوئے تھے (اور ان کی تعداد سات سو چالیس ہے) ان سب نے چیچک اور ہیضے کے ٹیکے لگوا لیے تھے اور اس لیے لگوا لیے تھے کہ کامران کی مصیبتوں سے بچ جائیں۔ لیکن بمبئی کے ستاون مسافروں کی وجہ سے کامران جانا ضروری ہو گیا۔ تین چار روز سے مختلف باتیں سنی جارہی ہیں، کبھی معلوم ہوتا ہے کہ صرف تین گھنٹے ٹھہر کر آگے روانہ ہو جائیں گے، کبھی سنا جاتا ہے کہ کامران کی مصیبتیں برداشت کرنی پڑیں گی۔ کامران کی ''ہولناکیوں'' کے متعلق مدت سے بہت کچھ معلوم ہے تاہم اسمٰعیل جو کچھ بیان کرتے رہے ہیں، اس سے اضطراب میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ سب کے کپڑے اُتروائے جائیں گے اور انھیں غیر ساتر چھوٹے چھوٹے کپڑے کمر میں باندھنے کے لیے دے دیے جائیں گے۔ پھر سارے حاجیوں کے کپڑے یک جا رکھ کر انھیں ''بھپارہ'' دیا جائے گا۔ یہ عظیم الشان عملی حفاظت کا طول، عرض اور عمق ہے جس کے لیے ہماری حکومت نے حاجیوں کا کامران ٹھہرنا ازروے حفظانِ صحت ضروری قرار دیا ہے اور جس کے لیے ہر حاجی سے کم و بیش دس روپے وصول کیے جاتے ہیں۔ اگر ہمیں کامران میں اترنا پڑا تو تفصیلات اس کے بعد لکھوں گا۔ ان شاءاللہ تعالیٰ

عدن اور باب المندب:

کل ساڑھے گیارہ بجے سے عدن کی پہاڑیاں نظر آنے لگی تھیں، ایک بجے عدن کے ساحل کے سامنے پہنچ گئے۔ حافظ صدیق صاحب نے وہاں سے دہلی تار دیا۔ لیکن ہمیں یہی بہتر نظر آیا کہ جدہ سے تار دیں۔ حافظ صاحب کو لاسلکی پیغام کے لیے ڈیڑھ روپیہ فی لفظ

اُجرت دینی پڑی۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اگر عدن سے تار دیں تو دس آنے فی لفظ لیتے ہیں۔لیکن جہاز پر سے تار چوں کہ پہلے عدن جائے گی اور بعد ازاں ہند اس لیے اجرت زیادہ ہے۔

جانِ برادر! آپ کو معلوم ہے کہ میرے لیے عدن اور باب المندب کا نظارہ بے حد رنج افزا ہوتا ہے۔ اس لیے کہ بحیرۂ قلزم اور بحیرۂ ہند کے یہ دو اہم مقامات کبھی اسلام کی متاع تھے، آج اغیار کے قبضے میں ہیں۔ آہ! مسلمانوں کے ہاتھ سے کیسی کیسی ارضی نعمتیں نکل گئیں۔ وہ کبھی بحروبر کے مالک تھے، افریقہ اور ایشیا کی تقریباً تمام قابل ذکر تریوں اور تمام قابل ذکر خشکیوں پر ان کی حکمرانی تھی، مگر آج سب جگہ غیر اسلامی پرچم لہرا رہا ہے۔ جو جزیرہ نظر آتا ہے انگریزوں کا۔ ساحل دکھائی دیتا ہے انگریزوں کا یا یورپ کی کسی دوسری قوم کا۔ رات کے نو بجے جزیرہ پیرم کی روشنیاں نظر آئیں۔ یہ جزیرہ باب المندب میں واقع ہے اور اب انگریزوں کے قبضے میں ہے۔ پیرم کی روشنیاں تقریباً دو گھنٹے تک بے حد انتہا دلکش منظر پیش کرتی رہیں۔ اور اکثر حاجی ڈیک پر کھڑے ان کا تماشہ دیکھتے رہے۔ لیکن میرے لیے یہ روشنیاں اسلامی حکمرانی اور فرماں روائی کے زوال پر آتشیں اشکوں کی حیثیت رکھتی ہیں اس لیے رات طبیعت بہت مکدّر رہوئی۔

جہاز میں چونکہ تمام مسافر مسلمان ہیں، عازمین بیت اللہ ہیں۔ اس لیے سب میں مذہب کا پہلو غالب ہے۔ تمام نماز ادا کرتے ہیں پانچوں وقت۔ دو تین اذانیں ہوتی ہیں، دو تین جماعتیں ہوتی ہیں۔ صبح سے غلس ہی کی حالت میں اللہ اکبر اور الصلوٰۃ خیر من النوم کی غفلت شکن صدائیں بلند ہونی شروع ہو جاتی ہیں۔ گزشتہ جمعہ کو (آج بدھ ہے) مولوی محمد حسین صاحب امرتسری نے جمعہ کا بندوبست فرمالیا، خطبہ پڑھا اور جمعہ پڑھایا۔ خطبے میں حج کے ضروری مسائل بیان کیے۔

کتابیں اور مطالعہ:

میں اس سفر میں اپنے ساتھ زیادہ کتابیں نہیں لایا۔ اس لیے کہ عبادتی سفر تھا اور جی چاہتا تھا کہ جتنا وقت ملے قرآن کریم کی تلاوت میں صرف کروں۔ قرآن کریم کے علاوہ

میرے پاس غالب ونظیری کے کلیات ،تاریخ فقہ اسلامی ،ارض القرآن، پیام مشرق ،امین ریحانی کی کتاب ''ابن مسعود آف آریبا'' (انگریزی) اورعرب کے ایک نقشے کے سوا اور کچھ نہیں ،لیکن اب تک حسب خواہش تلاوت نہیں ہو سکی۔ تاہم خدا کا شکر ہے کہ لیل ونہار کے بیشتر اوقات دینی مسائل اور دینی مذاکرات میں بسر ہوتے ہیں۔ مختلف آیات کے ترجمہ و تفسیر پر بحث ہوتی رہتی ہے۔ آج صبح حافظ محمد صدیق صاحب نے سورۂ یوسف کی مشہور آیت ''ولقد ہمت بہ وہم بہا'' ❶ کی تفسیر کا ذکر چھیڑا۔ اس کے ضمن میں اسمٰعیل نے بتایا کہ وہ ''عصمت انبیاء'' پر ایک مستقل رسالہ مرتب کر چکے ہیں جو بعض موانع کی وجہ سے اب تک شائع نہیں ہوا۔ چنانچہ اس سلسلے میں اسمٰعیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت داؤد علیہ السلام کے قصص کی بعض ضروری آیات کی تفسیر بیان کی ،جس سے ہم بے حد محظوظ ہوئے۔

ہمارے رفقا میں اکثر اپنے اپنے مشاغل کے ماہر ہیں۔ سیٹھ عبدالشکور سے باتیں ہوتی ہیں تو وہ بمبئی کی تجارت اور کاروباری اشغال کے متعلق بہترین معلومات پیش فرماتے رہتے ہیں۔ سیٹھ صاحب تقریباً ہر سال یورپ جاتے ہیں اس لیے ان سے یورپ کے حالات بھی معلوم ہوتے رہتے ہیں۔ نیز وہ بمبئی کی فری میسنری لاج کے ماسٹر ہیں۔ پرسوں رات فری میسنری کے متعلق ان سے دو گھنٹے باتیں ہوئیں۔ امام صاحب دہلی کے پرانے واقعات کو نہایت دل کش انداز میں سناتے رہتے ہیں۔ کل کپتان سے بڑی دیر تک تک باتیں ہوتی رہیں۔ فلبی کا ذکر آیا تو میں نے کہا کہ میں اس سے ۱۹۲۵ء میں جہاز میں ملا تھا۔ اس کی کتاب کا ذکر آ گیا تو کپتان نے پوچھا کہ کیا کہا تمھارے پاس وہ کتاب ہے؟ میں کہا ،وہ کتاب تو نہیں البتہ امین ریحانی کی کتاب ''ابن سعود آف اریبیا'' ہے چنانچہ کل کپتان نے مجھ سے یہ کتاب پڑھنے کے لیے لے لی۔ اب تقریباً نو بجے ہیں۔ ابھی کپتان آیا تھا اور کہہ گیا ہے کہ بارہ بجے کے قریب کامران پہنچ جائیں گے۔ نیز معلوم ہوا کہ کامران میں جو خط ڈالا جائے گا وہ دس روز کے اندر ہندوستان پہنچ جائے گا۔ اس لیے میں نے ارادہ کیا ہے کہ خیریت کے خطوط یہاں سے بھیج دوں لیکن حالات سفر کا خط ہوائی ڈاک کے ذریعے جدہ سے بھیجوں گا۔

❶ سورہ یوسف کی آیت نمبر ۲۴ کا ابتدائی ٹکڑا۔

قرنطینہ کی تیاریاں:

۳۰ راپریل، بعد عصر۔ کامران اور جدہ کے درمیان بحیرۂ قلزم میں

ہم کامران گیارہ بجے پہنچے تھے۔ ہمارے پہنچتے ہی کامران کے دس پندرہ لڑکے چھوٹی چھوٹی کشتیاں لے کر آ گئے۔ حاجی اُوپر سے اکنیاں، دوتیاں اور پیسے سمندر میں پھینکنے لگے اور یہ لڑکے سمندر میں غوطہ لگا کر پیسے سنبھالنے لگے۔ تقریباً ایک گھنٹے تک یہ مشغلہ جہاز کے اردگرد پوری سرگرمی سے جاری رہا۔ چوں کہ کامران پہنچنے تک ہمارے جہاز کو کوئی پیغام نہیں ملا تھا اس لیے اندیشہ تھا کہ ہم سب کو ساحل کامران پر اُتر کر حفظانِ صحت کے ان انتظامات سے ''تمتع اندوز'' ہونا پڑے گا جو ہماری حکومت نے ازراہِ نوازش کامران میں جاری کر رکھے ہیں۔ یعنی غسل اور کپڑوں کا بھپارہ۔ اس لیے ہم سب اسماعیل کے سر ہو گئے کہ خدا کے لیے ہمیں کسی طرح بچاؤ۔ اگر بچا نہیں سکتے تو کم از کم اتنا تو کر دو کہ کامران میں اُتر کر قرنطینہ میں غسل کے بعد ہمیں بھپارے سے نکلے ہوئے نم آلودہ کپڑے نہ پہننے پڑیں۔ نیز کانگریس کے حامی ہو۔ کانگریس سول نافرمانی کا اعلان کر چکی ہے اگر کپڑوں کے معاملے میں سول نافرمانی کر کے ہمارا ہاتھ بٹاؤ تو شاید یہ کانگریس کے لیے زیادہ مفید ہو۔ چنانچہ حافظ محمد صدیق صاحب، جناب شمس الحق صاحب، سیٹھ عبدالشکور صاحب اور ڈپٹی محمد شریف صاحب نے کپڑوں کا ایک ایک جوڑا اسمٰعیل کے حوالے کر دیا تاکہ اسمٰعیل ان کپڑوں کو بھپارے کے مرحلے سے گزارے بغیر ساحل پر لے جائیں۔ اصحاب پارچہ جات بعد غسل انھیں پہن سکیں اور بھپارے سے نکلے ہوئے نم آلود کپڑے پہننے کی مصیبت سے نجات پا جائیں۔ میں نے اور اسمٰعیل نے بھی اپنے لیے ایک ہی وضع کے دو تہ بند اور ایک ہی وضع کے دو کرتے رکھ لیے تھے۔ ہم نے اپنے سارے روپے ایک بٹوے میں ڈال کر جیب میں رکھ لیے۔ میں نے اپنی سنہری گھڑی بھی لے لی۔ اسماعیل اپنی نوے روپے کی رسٹ واچ ریل میں بھول آئے تھے جہاز کے تمام مسافر بھی اپنے کپڑے باندھ کر اور سامان سنبھال کر اُترنے کے لیے تیار ہو گئے۔

مصیبت سے بچ گئے:

اس اثنا میں ہمارے جہاز کو ساحل سے لاسلکی پیغام ملا کہ بمبئی والے حاجیوں کو علیحدہ کرلو۔ اگر وہ ٹیکے لگوانے کے لیے تیار ہوں تو خیر، ورنہ انھیں ساحل پر اترنا پڑے گا۔ سیٹھ عبدالشکور نے فی الفور بمبئی والوں کو ٹیکے لگوانے پر آمادہ کرلیا۔ وہ سب ایک کمرے میں بند ہو گئے۔ ساڑھے بارہ بجے کے قریب کامران کا ڈاکٹر جہاز پر آیا۔ ہمارے جہاز کے ڈاکٹروں نے بمبئی والوں کو ٹیکے لگوادیے۔ ہم سب کامران میں اترنے کی مصیبت سے بچ گئے۔ ہم سے چند گھنٹے قبل عدن سے حاجیوں کا ایک جہاز کامران پہنچا تھا۔ اس کے مسافر ہمارے سامنے ساحل پر اُترے اور بھپارے کے مرحلے سے گزر کر جہاز پر واپس آئے۔ ہمارے جہاز پر جو مستورات تھیں انھیں بھی مرد ڈاکٹر نے ٹیکہ لگایا۔ حالانکہ اسمٰعیل کہتے ہیں کہ کامران میں لیڈی ڈاکٹر موجود ہے۔ دو بجے کے قریب کامران کے ڈاکٹر سے ملاقات ہوئی۔ ان کا نام نور محمد چوہان ہے اور سُنا گیا ہے کہ کاٹھیاواڑ کے رہنے والے ہیں۔ جب تک کامران کے ساحل پر اُتر کر قرنطینہ کے مقررہ اشغال کی تکمیل کا مرحلہ درپیش تھا، ہم سب دُعائیں مانگ رہے تھے کہ ہمیں اُترنا نہ پڑے۔ جب ہمیں اترنے سے مستثنیٰ کر دیا گیا تو میرے دل میں کامران دیکھنے کا شوق پیدا ہوا لیکن اُترنے کی اجازت نہ مل سکی۔

جزیرہ کامران:

ہمارا جہاز ساحل سے تقریباً دو فرلانگ پر کھڑا تھا۔ میں دوربین لے کر تقریباً آدھ گھنٹہ جزیرہ کامران کو دیکھتا رہا۔ یہ جزیرہ سُرخ رنگ کی سخت مٹی کا ایک بہت بڑا تودہ ہے جو ساحلِ یمن کے قریب بحیرۂ احمر کے پانی سے باہر نکل آیا ہے۔ کہیں کہیں خشک جُھلسے ہوئے پہاڑوں کے آثار نمودار ہیں۔ جزیرہ بھر میں نہ کوئی درخت نظر آیا، نہ ہی آبادی اور نہ سبزی۔ چند بارکیں ساحل کے قریب بنی ہوئی ہیں جو ایک دوسری سے الگ الگ ہیں۔ لاسلکی کے دو کھمبے ہیں۔ چند جھونپڑ نظر آئے جن کے اردگرد جنگلا لگا دیا گیا ہے۔ یہ قرنطینہ ہے سُنا جاتا ہے کہ اب چند دکانیں بھی لگ گئی ہیں۔ عام اہلِ جہاز نے مچھلی اور مُرغیاں خریدیں۔ میں نے اسماعیل سے کہا کہ ہم بھی مُرغیاں خرید لیتے ہیں۔ کھانے کا انتظام اگرچہ ہوٹل میں ہے

لیکن ہم علیحدہ پکوا سکتے ہیں۔ اسماعیل نے بے تکلفی سے کہہ دیا کہ ہماری جماعت کے لیے کھانے پینے کی چیزیں خرید نا مناسب نہیں۔ ہمارا یہ امر خلاف معمول و دستور جماعت ہے۔ میں نے پوچھا، کہ کون سی جماعت ہے؟ کہنے لگا کہ "علماء کی جماعت" ناچار میں خاموش ہو گیا۔ حق یہ ہے کہ ہم اچھے رہے۔ مچھلی کل بکثرت کھا چکے ہیں۔ اور بغیر خریدے مرغیاں ان شاء اللہ آج کھائیں گے۔ میں "علما" کی جماعت میں تو شریک نہیں ہوں لیکن اسماعیل کی وجہ سے عملاً "علما" میں شمار ہوتا ہوں یا جس حد تک علما کی خاطر تو اضع کا تعلق ہے، مجھے بھی حصہ ملتا رہتا ہے۔ اگر چہ حقیقۃً اسماعیل کے طفیلی ہی کی حیثیت سے ملتا رہتا ہے۔

ہمارے جہاز کو ٹھہرے ہوئے دو گھنٹے گزرے تھے کہ ٹرنر ماریسن کا جہاز "رحمانی" ہم سے آملا۔ ہم تو تین بجے فارغ ہو گئے لیکن "رحمانی" کو روک لیا گیا۔ شاید آج شام کو یا کل صبح کے قریب کامران سے روانہ ہو۔ اس پر ہمارا کپتان بے حد خوش ہوا اور تین بجے کے قریب فاتحانہ انداز میں "خسرو" جہاز کو "رحمانی" جہاز کے پاس سے گزارتا ہوا جدہ کی جانب روانہ ہو پڑا۔ عدن والا جہاز ہم سے پہلے روانہ ہو چکا تھا۔ لیکن چوں کہ اس کپتان کو کامران کے گرد و پیش کے سمندر کے متعلق زیادہ تجربہ نہ تھا اس لیے وہ بڑا چکر کاٹ کر کھلے سمندر میں آیا۔ ہمارا کپتان خسرو کو ساحلِ کامران کے قریب سے گزار کر سمندر میں داخل ہو گیا اور عدن والے جہاز کو بھی میلوں پیچھے چھوڑ آیا۔ ہم سب نے اس کی مہارتِ فن کی بے حد تعریف کی جس پر کپتان دیر تک خوشی سے قہقہے لگاتا رہا۔

ماہی خوری:

جہاز کے روانہ ہوتے ہی مچھلی تلنے کا کام شروع ہوا۔ آگرہ والے سیٹھ یوسف صاحب چار بجے کے قریب میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ اپنے کیبن میں چلو۔ میں گیا تو تلی ہوئی مچھلی لے آئے جو میں نے، اسماعیل نے، سیٹھ عبدالشکور نے اور ڈپٹی صاحب نے کھائی۔ اُوپر آیا تو حافظ صاحب کی مچھلی تیار ہو چکی تھی۔ اس کی تعریف کن الفاظ میں کروں۔ ہم چاروں آدمیوں کے علاوہ امام صاحب، حاجی عبدالجلیل صاحب، جملہ رفقاے حافظ محمد

صدیق صاحب، مسقط کے تاجر وغیرہ نے کھائی اور اس قدر کھائی کہ ہم میں سے اکثر شام کا کھانا نہ کھا سکے۔

ایک رنج دِہ واقعہ:

کامران سے روانہ ہوتے وقت ایک نہایت ناگوار اور رنج دِہ منظر دیکھا۔ کشتیوں والے غریب سواحلی فروخت کے لیے مچھلیاں، مرغیاں، برف اور اس قسم کی دوسری چیزیں لے کر آئے تھے۔ تمام اہل جہاز نے اپنی اپنی ضرورت کے مطابق چیزیں خرید لیں۔ کشتی والے چوں کہ جہاز کے اُوپر نہیں آسکتے تھے، اس لیے انھوں نے چیزیں جہاز پر پہنچانے کے لیے تاڑ کے پتوں کی چھوٹی چھوٹی ٹوکریاں بنالی تھیں۔ ان ٹوکریوں کے ساتھ لمبی لمبی رسیّاں بندھی ہوئی تھیں۔ جس حاجی کو کسی چیز کی ضرورت ہوتی تھی۔ کشتیوں والے ان ٹوکریوں میں چیزیں رکھ کر رسیّاں کھینچتے۔ ٹوکریاں اُوپر پہنچ جاتیں۔ حاجی ٹوکریوں میں سے چیزیں نکال لیتے اور مقرر قیمت ان میں رکھ دیتے۔ خرید و فروخت کا سلسلہ جہاز کی روانگی تک جاری رہا۔ جب جہاز چل پڑا تو بعض اصحاب نے اس وقت مچھلی خریدی۔ چوں کہ جہاز کی رفتار مدھم تھی اس لیے کشتی والا ساتھ ساتھ کشتی چلاتا ہوا چلا گیا۔ لیکن جن لوگوں نے مچھلی خریدی تھی انھوں نے ٹوکری اُوپر رکھ لی تھی جہاز کی رفتار تیز ہوگئی تھی کشتی والا پریشان ہونے لگا۔ اسماعیل نے بلند آواز میں کہا ٹوکری چھوڑ دو۔ دو تین منٹ کے بعد مشکل سے ٹوکری چھوڑ دی گئی۔ کشتی والے کے پاس ٹوکری پہنچی تو معلوم ہوا کہ مچھلی خریدنے والوں نے مقررہ قیمت سے چار آنے کم قیمت کشتی میں رکھی تھی۔ "عازمین حج" کی طرف سے اس قسم کی حرکات کا صدور چیزیں فروخت کرنے والے غریبوں کے دل پر اچھا اثر نہیں ڈال سکتا۔ میرا خیال ہے، ایسے ہی واقعات ساحلی مقامات کے دکانداروں کو اخلاقی اعتبار سے پست بنا دیتے ہیں۔

فاتح اُندلس طارق:

ڈاکٹر ولی محمد صاحب بھوپالی ایک روز اسماعیل کے ساتھ ہمارے پاس آگئے۔ ان سے تقریباً ایک گھنٹے تک تاریخ اُندلس کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے بہت

سے واقعات سُنائے۔ میں نے اندلس کے فاتح اوّل طارق کے متعلق سوالات کیے۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ طارق عرب نہیں تھا، بلکہ بربری الاصل تھا۔ موسیٰ نے اسے محض حالات کی تحقیق کے لیے اندلس بھیجا تھا۔ طارق نے اندلس پہنچ کر حالات ساز گار پائے تو فتوحات کا سلسلہ شروع کر دیا۔ موسیٰ کو فتوحات کی اطلاع ملی تو اس نے طارق کو ٹھہر جانے کا حکم بھیج دیا۔ غالباً اس خیال سے کہ فتح اندلس کا اعزاز طارق کو نہ ملے۔ طارق نے موسیٰ کے حکم کو اپنے رفقا کے سامنے پیش کر کے مشورہ کیا تو سب نے رائے دی کہ اقدام کا سلسلہ جاری رہنا چاہیے ورنہ ہسپانیہ والے حملہ کر کے اسلامی فوج کو تباہ کر ڈالیں گے۔ اس وجہ سے طارق نے پیش قدمی جاری رکھی۔ موسیٰ ہسپانیہ پہنچا تو طارق اس کی پیشوائی کے لیے آیا۔ کافی فاصلے سے وہ اپنے سپہ سالار کے اعزاز میں گھوڑے سے اُتر پڑا اور وقت کے قاعدے کے مطابق اس نے موسیٰ کے گھوڑے کی رقاب کو بوسہ دیا۔ لیکن موسیٰ جوش اور غصے میں بھرا ہوا تھا۔ اس نے اپنا تازیانہ اٹھا کر اسی حالت میں طارق کو مارنا شروع کر دیا۔ بربروں اور عربوں میں رقابت کی آگ کا یہ پہلا شعلہ تھا، جو فتوحات اندلس کے آغاز میں ہسپانیہ کے اندر بھڑکا اور جس نے آگے چل کر اتنی خطرناک صورت اختیار کر لی کہ اندلس کی اسلامی سلطنت تباہ ہو گئی۔ طارق کی عمر اس وقت بیالیس یا پینتالیس برس تھی۔ موسیٰ ستر بہتر کے سن کو پہنچ چکا تھا۔ اس وقت مغرب اقصیٰ میں یہ دونوں شخص عساکرِ اسلامیہ کے بہترین سپہ سالار اور بہترین قائد تھے۔ ان کے جھگڑے نے نازک صورت اختیار کر لی تو دربارِ خلافت نے دونوں کو دمشق بلا لیا۔ دونوں مناصب سے معزول ہو گئے۔ اور انتہائی عسرت و تنگ دستی کی حالت میں دمشق کے جنوب میں غیر معروف مقام پر انتقال کر گئے۔ ڈاکٹر ولی محمد صاحب نے مستشرقین یورپ کی لاعلمی و بے خبری کے متعلق بعض واقعات بیان کیے۔ آپ مشہور انگریز مورّخ سٹینلے لین پول سے بھی ملاقات کر چکے ہیں اور جیسا کہ اوپر عرض کر چکا ہوں اب ٹیونس، الجزائر، مراکش وغیرہ کو جا رہے ہیں۔ خاص طور پر قیروان اور تلمسان کو دیکھیں گے۔ قیروان میں انھیں عقبہ کی قبر پر فاتحہ خوانی کا شوق ہے۔ اور تلمسان وہ مقام ہے جو

قرونِ اُولیٰ ہی میں مسلمانوں کے مذہبی علوم کا مرکز بن چکا تھا۔

خیرالدین بروسا:

آپ کو معلوم ہے کہ ہم نے اپنے سالگرہ نمبر میں منجملہ اور مضامین کے خیر الدین باربروسا اور اس کے بھائی عروج کے سوانح حیات بھی شائع کیے تھے۔ ان سوانح کا بیشتر حصہ لین پول کی کتاب ''بربر کا رسیرس'' (یعنی بربری قزاق) سے ماخوذ تھا۔ لین پول لکھتا ہے کہ خیر الدین کے بڑے بھائی عروج نے بحری قزاقی کا سلسلہ شروع کیا تھا اور وہ قزاقی ہی کے لیے ٹیونس اور الجزائر کی طرف نکل آئے تھے۔ لیکن میری تحقیق کا نتیجہ یہ تھا کہ عروج وخیر الدین کے ٹیونس اور الجزائر آنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ اندلس کے مسلمانوں کو اندلس سے نکال کر شمالی افریقہ پہنچائیں۔ اس لیے کہ اس وقت تک غرناطہ پر عیسائی قابض ہو چکے تھے۔ ہسپانیہ کی فضا توحید کے غلغلوں سے محروم ہو چکی تھی اور مسلمانوں پر ایسے ہول ناک مظالم ہو رہے تھے کہ دُنیا کی کوئی بھی تاریخ اُن کی نظیر پیش نہیں کر سکتی۔ نیز میں نے خیرالدین کے حالات میں لکھا تھا کہ عروج و خیر الدین نے قزاقی کی غرض سے بحری ترکتازیاں شروع نہیں کی تھیں۔ بلکہ وہ عیسائیوں کے ان مظالم کا انتقام لینا چاہتے تھے جو اُندلس کے مسلمانوں پر علی الخصوص اور عام مسلمانوں پر علی العموم بر پا تھے۔ ڈاکٹر ولی محمد صاحب سے میں نے عروج وخیر الدین کے متعلق سوالات کیے تو انھوں نے بھی بلا تامل فرمایا کہ دونوں بھائیوں کی ترکتازیاں مسیحی مظالم کے انتقام کے طور پر شروع ہوئی تھیں۔ مجھے ڈاکٹر صاحب کی زبان سے یہ سُن کر بے حد خوشی حاصل ہوئی کہ آج سے دو سال قبل میں نے عام حالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے جو رائے قائم کی تھی۔ وہ ڈاکٹر صاحب ایسے محقق مورخ کے نزدیک ہر اعتبار سے صحیح ہے۔

حضرت میاں صاحب مرحوم:

حافظ محمد صدیق صاحب حضرت میاں نذیر حسین صاحب مرحوم محدث دہلوی کو دیکھ چکے تھے۔ ان سے میاں صاحب مرحوم کے متعلق میں بہت سی باتیں پوچھتا رہا۔ حافظ صاحب

نے حضرت میاں صاحب مرحوم کے ایثار کا ایک نہایت پُر تاثیر واقعہ بیان فرمایا۔ ایک روز شام کے وقت بے حد بارش ہوئی نیز سخت اولے پڑے۔ بازاروں میں پانی بھر گیا۔ سردی کا موسم تھا حضرت میاں صاحب مغرب کے بعد گھر تشریف لے جا چکے تھے لیکن تمام طلبا مسجد میں رُکے رہے اور اپنے کھانے کا بندوبست نہ کر سکے۔ رات گیارہ بجے کے قریب بارش تھمی تو مسجد کے دروازے پر کسی نے دستک دی۔ دروازہ کھولا گیا تو حضرت میاں صاحب مرحوم تھے جو اپنے گھر سے سارا کھانا اُٹھا لائے تھے تاکہ طلبا بھوکے نہ رہیں۔ اللہ اکبر! آج ایسے پاک نفس انسان کہاں ملتے ہیں۔ حافظ صاحب فرماتے ہیں کہ ہم صبح کی نماز حضرت میاں صاحب کے ساتھ ادا کرتے تھے۔ آپ آخری عمر میں صبح کی نماز میں عموماً سورۃ المرسلات پڑھا کرتے۔ جب فَبِأَيِّ حَدِيثٍ بَعْدَهُ يُؤْمِنُونَ پر آتے تو آواز بھرا جاتی اور ایسی تاثیر پیدا ہو جاتی کہ میری (حافظ صاحب کی) آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل آتے۔ نماز میں ایسا لطف پھر کبھی نہیں ملا۔

مستورات کی تکالیف:

بحری سفر کے جو انتظامات اس وقت موجود ہیں انھیں ملحوظ رکھتے ہوئے میری رائے یہ ہے کہ پردہ دار بیبیوں کے لیے حج کا سفر سخت مشکلات سے لبریز ہے۔ ان کے لیے پاخانوں اور غسل خانوں کا علیحدہ انتظام نہیں ہے۔ بیٹھنے، اٹھنے اور سونے کی کوئی علیحدہ جگہ نہیں۔ تھرڈ کلاس میں اوّل تو پہلے ہی بے حد حبس ہوتا ہے اور مسافروں تک ہوا پہنچنے کا کوئی انتظام نہیں۔ لیکن پردہ دار مستورات کو اس حبس میں ایک نئے حبس کا بندوبست کرنا پڑتا ہے۔ یعنی کپڑے تان کر پردہ کیا جاتا ہے جس سے ہوا اور بھی رُک جاتی ہے نیز پاخانوں اور غسل خانوں تک آنے جانے میں انھیں قدم قدم پر مردوں کے درمیان میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ فرسٹ کلاس میں بھی مستورات کے لیے اس کے سوا کچھ آرام نہیں کہ کیبن الگ مل جاتا ہے۔ ٹرنر ماریسن کے جہازوں پر فرسٹ کلاس کے تقریباً سات کیبنوں کے لیے ایک پاخانہ اور ایک غسل خانہ ہے اور اس میں مردانہ زنانہ کی کوئی تمیز نہیں

مسلمانوں کی مذہبی حمیّت:

لیکن مسلمانوں کے جوشِ ایمانی اور حُبِ بیت اللہ کی یہ حالت ہے کہ کسی تکلیف کی پروا نہیں کرتے بلکہ سفرِ حج میں تکلیف کے ذکر کو بھی گناہ سمجھتے ہیں۔ ہر شخص کی زبان سے یہی سنا جاتا ہے کی اس سفر میں جتنی تکلیفیں پیش آئیں اتنا ہی ثواب زیادہ ہوگا۔ تکالیف کے ہجوم میں اس نوع کے مذاکرات سُن کر اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہمارے آقا و مولا صلّی اللہ علیہ وسلّم کی ذات بابرکات اپنے پیروؤں اور حلقہ بگوشوں کی ذہنیتوں میں کتنا بڑا انقلاب پیدا کر چکی ہے۔ تیرہ سو سال گزر چکے ہیں، اس دوران صدہا حکومتیں قائم ہوئیں اور مٹیں، صدہا مقامات پر اسلام کا علم نصب ہوا اور اُکھڑا۔ صدہا ممالک میں مسلمان توحید کا پیغام لے کر گئے۔ کامران ہوئے اور کئی ملکوں میں اُن کی فاتحیت مفتوحیت میں بدل گئی، لیکن بیت اللہ الحرام کی شمع جہاں افروز پر پروانگی کا عالم اب بھی وہی ہے، جو آج سے تیرہ سو سال پہلے تھا۔ شمال، جنوب، مشرق، مغرب، ہر طرف سے کلمہ گویانِ توحید کھنچے چلے آتے ہیں۔ مراکش، الجزائر، مصر، سوڈان، ترکی، تاتار، افغانستان، ایران، ہندوستان، جاوا، یمن، نجد، شام، فلسطین، سالی لینڈ، حضرموت، مسقط، عراق، غرض کہ کون سا مقام ہے جہاں کے فرزندانِ توحید ہزاروں کی تعداد میں ہر سال بیت اللہ شریف نہیں آتے۔ یہ سلسلہ خلافت راشدہ کے عہدِ یمن وبرکت و امن میں قائم رہا۔ تو بعد کے مختلف ادوار بدامنی وقتل و غارت میں بھی جاری رہا اور اب سلطان کے عہدِ امن و راحت میں بھی جاری ہے۔ جب جہاز چھ چھ مہینے میں ہندوستان سے حجاز پہنچتے تھے، اُس وقت بھی جاری تھا اور اب کہ چھ یا آٹھ دن میں پہنچ جاتے ہیں اب بھی جاری ہے۔ سمندر طوفانوں سے لبریز ہوں یا ان سطح پر سکونِ عام طاری ہو، جانوں کا خطرہ ہو یا امن ہو، گردنیں کٹتی ہوں یا خون بہتے ہوں یا جانوں کے علاوہ اموال کی محفوظیت کا بھی یہ عالم ہو کہ ایک حبہ بھی ضائع نہ ہو سکے، زیارت و حج کا سلسلہ نہ رُکا ہے نہ رُک سکے گا۔ قرامطہ نے اپنے عہدِ تسلط میں حج کو روکنے کے لیے بہت کچھ کیا۔ طاہر قرامطی نے صرف ایک حج کے موقع پر تیس ہزار فرزندانِ توحید کو حرم میں شہید کر دیا۔

زم زم کو لاشوں سے بھر دیا۔ حجرا سود کو اکھاڑ کر اپنے دارالحکومت میں لے گیا۔ لیکن مسلمان اس حالت میں بھی بکثرت بیت اللہ شریف جاتے رہے۔

بیت اللہ کی مرکزیت:

یہ ہے مرکزیت۔ اسے کہتے ہیں اُمّت کو ایک مقام سے وابستہ کرنا۔ دُنیا کا کون سا مذہب ہے جس نے اپنے پیروؤں کے دل میں مرکز کے ساتھ عقیدت، شیفتگی اور عشق کے ایسے گہرے، عمیق اور کبھی افسردہ نہ ہونے والے جذبات پیدا کیے اور دُنیا کا کون سا مقام ہے جس نے گزشتہ ساڑھے تیرہ سو سال کی مُدت میں اتنے بندگانِ خدا کو اپنی طرف کھینچا۔ حجاز ریویرا نہیں، کشمیر نہیں، لوزان نہیں کہ لوگ سیر و تفریح کے لیے خود بخود کھنچے آئیں بلکہ ہر اعتبار سے تکالیف و مصائب کا مرقع پیش کرتا ہے۔ گرمی بے پناہ، تمازت آفتاب جسم سوز، پانی کم یاب، سبزی و روئیدگی ناپید، درخت مفقود، جسمانی آسائش و راحت کے سامان بے حد قلیل۔ لیکن اسلام کے حلقہ بگوش اپنی راحت و آسایش کی زندگیاں چھوڑ کر جماعتوں اور قافلوں کی شکل میں اُدھر جا رہے ہیں۔ ہر سمت سے، ہر ملک سے جا رہے ہیں۔ مسلمان آج وہ نہیں رہے جو تیرہ سو سال پہلے تھے۔ لیکن حرمین شریفین کے ساتھ ان کا عشق اب تک شباب پر ہے اور ان شاء اللہ تا قیام قیامت شباب پر رہے گا۔ ان حقایق کو سامنے رکھ کر، اُس ذاتِ بابرکت کے علوِ منزلت کا اندازہ کیجیے، جو کائنات انسانیت کے فرزندانِ توحید کو "وادیِ غیر ذی زرع" کے ساتھ اس ہر طرح دایما وابستہ کر دینے کا موجب بنی۔ صلّی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلّم تسلیمًا کثیرًا کثیرا

یکم مئی ۱۹۳۰ء (جدہ سے تقریباً بیس گھنٹے کے سفر پر)

فریضہ تشکّر:

ابھی معلوم ہوا ہے کہ ہم ان شاء اللہ کل (بروز جمعۃ المبارک) صبح کے سات بجے جدہ پہنچ جائیں گے کل شام کو ہم سب نے جہاز کے ڈیک پر کھڑے ہو کر ذی الحجہ کا ہلال دیکھا۔ اب اس خط کو میں ختم کرتا ہوں۔ ہو سکا تو جدہ اُترنے کے حالات اختصاراً لکھ دوں

گا۔ لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ وقت مل نہیں سکے گا! اس لیے کہ جدہ پہنچتے ہی ہماری کوشش یہ ہوگی کہ جلد از جلد اُتر کر موٹر میں مکہ معظمہ روانہ ہو جائیں تا کہ جمعہ کی نماز حرم پاک میں ادا کر سکیں۔ یہ خط جدہ سے ڈاک میں ڈال دوں گا۔ کل شام کو ہم نے اعلیٰ حضرت جلالۃ الملک، شیخ عبداللہ سلیمان دارالکسوۃ اور شیخ عبدالرحمٰن مظہر کو مکہ معظمہ میں اور شیخ عبداللہ زئیل اور مفتی احسان اللہ صاحب کو جدہ میں تار دے دیے تھے، اس لیے نہیں کہ ہمارے واسطے کوئی انتظام ہو جائے۔ اس کی نہ آرزو ہے نہ ضرورت! صرف اس لیے کہ دوستوں کو شکایت پیدا نہ ہو اور چوں کہ دوستوں کو تار دیے تھے اس لیے اعلیٰ حضرت کو بھی رسمی اطلاع دینی پڑی، ورنہ جتنی درماندگی کی حالت میں حرم پاک میں پہنچیں، اتنی ہی توقع ہے کہ بخشایشِ معاصی کا بندوبست ہو جائے گا۔

برادرِ عزیز و مکرم (اسماعیل) کی نوازشوں اور محبت و شفقت نے یہاں پہنچنے کی سعادت سے بہرہ اندوز کیا۔ ہر وقت دُعا کرتا رہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ میرے بھائی کو دینی و دُنیوی نعمتوں سے شاد کام رکھے۔ سفر کے دوران اس کی بے لوث محبت کے جو تجربے ہوئے ہیں، وہ عمر بھر یاد رہیں گے۔ میں اسماعیل کو سات آٹھ سال سے جانتا ہوں۔ اس دوران میں خدا کے فضل و کرم سے ہمیشہ بہت اچھے تعلقات رہے، لیکن اُس کی محبت کے جو کرشمے مجھے اس سفر میں نظر آئے، پہلے کبھی نظر نہیں آئے تھے!

حافظ محمد صدیق صاحب کے الطاف و کرم کا شکریہ الفاظ میں ادا نہیں کر سکتا۔ ان کی وجہ سے مجھے ہر لحظہ بہتر سے بہتر آسایشیں مہیا ہوتی رہیں۔ میں اکثر محسوس کرتا تھا کہ ان کے لیے تکلیف دِہ بن رہا ہوں، لیکن حافظ صاحب اور ان کے رفقا حسنِ سلوک اور محبت و شفقت میں برابر میرے ساتھ عزیزوں کا سا سلوک فرماتے رہے۔

(انقلاب: ۳۰ رمئی ۱۹۳۰ء ص ۲، ۳)

باب سوم

سرزمین مقدس حجاز

مکہ مکرمہ ۵؍مئی ۱۹۳۰ء

مکہ مکرمہ پہنچے ہوئے آج تیسرا دن ہے۔ چوں کہ ہم جدہ سے رات کے گیارہ بجے کے قریب موٹر میں سوار ہوئے تھے اور حرم پاک میں پہنچ کر عمرہ سے فراغت حاصل کرتے کرتے نمازِ فجر کی جماعت کھڑی ہوگئی تھی اس لیے دو اور تین کی درمیانی شب میں ساری رات بیدار رہے۔ ۳؍مئی کے دن میری طبیعت بے حد مکدر رہی۔ شام کے وقت معدے میں امتلا کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ سر میں درد ہونے لگا اور میں ۳؍اور ۴؍کو مریضوں کی طرح بستر پر پڑا رہا۔ آج اس قابل ہوا ہوں کہ حالاتِ سفر کی باقاعدہ ترتیب کا فرض ادا کرسکوں۔

منظرِ احرام:

میں نے سابقہ عریضے میں کامران تک کے حالات لکھ دیے تھے۔ یکم مئی کی صبح کو کپتان نے بتا دیا تھا کہ شام کو چھ بجے کے قریب جہاز یلملم کے محاذ میں پہنچے گا جو یمن کی سمت سے آنے والوں کی میقات ہے اور جہاں سے ہندوستانی حاجی احرام باندھتے ہیں۔ یکم مئی کی صبح کو نماز سے فارغ ہوئے اور دن کی روشنی نمودار ہوئی تو متعدد عازمین حج احرام باندھتے ہوئے اور لبیك اللھم لبیك پکارتے ہوئے نظر آئے۔ دن بھر احرام باندھنے کا سلسلہ جاری رہا۔ ہم نے صبح ہی فیصلہ کرلیا تھا کہ شام کے چار بجے احرام کی تیاری کریں گے۔ پانچ اور چھ کے درمیان جہاز نے یلملم کے محاذ میں پہنچنے کا وسل دیا ہم اور تمام دوسرے عازمین

حج اس وقت تک احرام باندھ چکے ہیں۔ صرف چند باقی تھے۔ سنا تھا کہ وہ جدہ اُتر کر یلملم جاتے ہیں اور وہاں سے احرام باندھتے ہیں۔ محرمین کی صفیں دیکھ کر دل پر عجیب کیفیت طاری ہوئی۔ سب کی کمر میں ایک ایک سفید چادر، سب کے سر ننگے، سب کی زبانوں پر لبيك اللهم لبيك لا شريك لك لبيك ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قدسیوں کی کوئی جماعت آسمان سے اتر آئی ہے۔ احرام کے حقائق و معارف کے متعلق بہت کچھ معلوم تھا، لیکن خود احرام باندھ کر اور محرمین کی قدوسی جماعت میں شریک ہو کر اس کے جو معارف سمجھ میں آئے، ان کی نسبت کیا عرض کروں۔ دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالی ہر مسلمان کی زندگی میں کم از کم ایک مرتبہ ضرور اس مقدس مرحلے سے گزرنے کا موقع عطا کرے۔ اس کے بغیر بیت اللہ کی مرکزی حیثیت اور دین قیم کی شانِ اجتماع کا حقیقی راز سمجھ میں نہیں آ سکتا۔

ہمارے ساتھ بڑے بڑے اَپ ٹو ڈیٹ جنٹل مین موجود تھے۔ مثلاً ہمارے سیٹھ عبدالشکور۔ لیکن آج وہ عملاً غریب اور مسکین سے مسکین حاجی کے شریک حال تھے۔ ان میں اور دوسرے حاجیوں میں بال برابر بھی امتیاز نہ تھا۔ غور کیجیے کہ ارکان و آدابِ حج کے واضعؑ نے اُمت میں مساوات پیدا کرنے کا کتنا دلکش طریقہ تجویز کر دیا ہے۔

"تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے" کا حقیقی منظر یہاں نمایاں تھا۔

یکم مئی کی رات کو ہم سب بہ حالتِ احرام سوئے۔ تقریباً تمام حجاج نے تمتع کا احرام باندھا تھا۔ شب بھر منٹ منٹ کے بعد لبیک اللھم لبیک کی صدائیں آتی رہیں۔ بارگاہِ ایزدی میں اس اہتمام و اشتیاق کے ساتھ حاضر ہونے کا جذبہ دیکھ کر دل بے تاب ہو جاتا تھا۔

بندرگاہ جدہ:

ہمارا خیال تھا کہ صبح کی نماز سے فارغ ہوتے ہی جدہ کا مقدس ساحل نظر آ جائے گا لیکن نماز سے فارغ ہوئے تو کپتان نے بتایا کی تیز مخالفانہ تموج کی وجہ سے جدہ پہنچنے میں دو گھنٹے کی تاخیر ہو جائے گی۔ ہم سب اپنا سامان رات ہی باندھ چکے تھے۔ بچی کھچی متفرق چیزیں صبح کی نماز ادا کرنے کے بعد سمیٹ لی گئیں۔ اور میں، اسمٰعیل، سیٹھ عبدالشکور اور ڈپٹی

صاحب اُوپر کی منزل میں حافظ صاحب کے پاس چلے گئے۔ ساڑھے آٹھ بجے کے قریب ساحل نظر آنے لگا۔ چند منٹ کے بعد پائیلٹ (PILOT) کی کشتی آ گئی۔ بندرگاہ جدہ کے قریب آب دوز پہاڑیوں کا ایک عجیب سلسلہ ہے، جن میں سے بعض پانی کی سطح کے بالکل برابر پہنچی ہوئی ہیں۔ اس وجہ سے بندرگاہ میں اعلیٰ درجے کے واقف کار کی راہ نمائی کے بغیر داخل ہونا مشکل ہے۔ ویسے بھی بندرگاہ میں ہر جہاز پائیلٹ کی راہ نمائی ہی میں داخل ہوتا ہے۔ اسماعیل سے معلوم ہوا کہ جدہ میں صرف دو شخص ہیں جو بندرگاہ کی آب دوز پہاڑیوں کے سلسلے سے پوری واقفیت رکھتے ہیں۔ دونوں حقیقی بھائی ہیں۔ ان میں سے ایک ہمارا پائیلٹ تھا۔

ساحلِ جدہ پر:

ہمارا جہاز ساڑھے نو بجے کے قریب لنگر انداز ہوا۔ بندرگاہ میں اس وقت تقریباً دس جہاز کھڑے تھے جن میں سے اکثر جہاز ٹرنر ماریسن کے تھے۔ ہمارا جہاز ٹھہرا تو سب سے پہلے ایک لانچ (موٹر کشتی) آئی جس پر حکومتِ حجاز کا سبز جھنڈا لہرا رہا تھا۔ لانچ قریب آئی تو معلوم ہوا کہ سیٹھ عبدالشکور کے ماموں عثمان سلیمان اپنے بھانجے کو لینے آئے ہیں۔ لیکن کوئی شخص ڈاکٹر کے جہاز پر آنے سے قبل نہیں آ سکتا تھا۔ چند منٹ کے بعد دوسری لانچ آئی جس میں منشی عزیز الدین صاحب (ٹرنر ماریسن کے منشی) آئے۔ ان سے میں ۱۹۲۵ء سے واقف تھا۔ پھر ڈاکٹر صاحب آئے۔ ان کے بعد خان صاحب منشی احسان اللہ صاحب لانچ میں تشریف لائے۔ میں سابقہ عریضے میں عرض کر چکا ہوں کہ جلالۃ الملک حکومت حجاز کے وزیرِ مال شیخ عبداللہ سلیمان اور گورنر جدہ شیخ عبداللہ علی رضا کے ساتھ ہم نے منشی احسان اللہ خاں کو بھی تار دے دیا تھا، اس لیے کہ ان سے دیرینہ تعلقات تھے اور ہر سال بہ اصرار حجاز آنے کی دعوت دیتے رہتے تھے۔ منشی صاحب ہمارا تار پہنچنے سے قبل اہل و عیال سمیت مکہ معظمہ تشریف لے جا چکے تھے۔ ہمارا تار ان کے مکان پر پہنچا تو ان کے آدمی نے فون کے ذریعے سے انھیں مکہ معظمہ اطلاع دی۔ وہ یکم مئی کی رات کو موٹر میں سوار ہو کر جدہ تشریف

لے آئے۔ ہمیں یہ کیفیت معلوم ہوئی تو بڑا رنج ہوا کہ ناحق ان کو لمبے سفر کی زحمت دی۔ تار محض اس لیے دیا گیا تھا کہ وہ کہیں یہ نہ سمجھیں کہ ہم سے فریضۂ دوستی کی بجا آوری میں کوتاہی ہوئی۔ اس وقت سے لے کر آج تک منشی صاحب نے ہم پر جو احسانات کیے ہیں، جو نوازشیں فرمائی ہیں ان کے بیان سے میرا قلم قاصر ہے۔ مجھے منشی صاحب کی عنایات پر ہمیشہ بھروسا رہا ہے لیکن اس سفر میں انھوں نے مجھے اپنے احسانوں کے نیچے اس طرح دبا دیا تھا کہ شاید تاحیات ان کا حق ادا نہ کر سکوں گا۔

ہم جہاز پر کھڑے منشی صاحب کے ساتھ اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہے تھے کہ ہمارے لیے حکومت کی طرف سے ایک موٹر لانچ میں دو آدمی آگئے، جنھوں نے چند منٹ میں ہمارا سامان اتار کر لانچ میں رکھ لیا۔ ہم نے اپنے دوستوں کو ایک لانچ میں سوار کرایا، دوسری لانچ میں خود سوار ہوئے اور تقریباً پندرہ منٹ میں ساحل پر پہنچ گئے۔ ۲۶ر جنوری ۱۹۲۶ء کو شام کے وقت ساحلِ جدہ کو چھوڑا تھا۔ ۲ر مئی ۱۹۳۰ء کو گیارہ بجے کے قریب پھر میرے قدم اس مقدس ساحل کی خاک پاک سے مشرف ہوئے۔ خدا کرے ہر مسلمان کے قدم اس ساحل سے مشرف ہوں۔

رفقا کی علیحدگی:

ساحل پر اُترنے کے بعد سب سے پہلے پروانہ ہائے راہ داری دیکھے جاتے ہیں۔ سامان دوسری طرف اتارا جاتا ہے اور وہاں سے سیدھا چنگی خانے کے شیڈ میں پہنچ جاتا ہے ہم ساحل پر اُترے تو شیخ عبداللہ علی رضا گورنر جدہ مل گئے۔ انھوں نے فی الفور ایک آدمی کو بھیج کر ہمارا سامان کھولے بغیر چنگی خانہ سے باہر نکلوا دیا۔ اس دوران میں برادرانِ محترم خلیفہ محمد حسین صاحب اور میاں محمد عاشق صاحب باغبان پوری صاحبان شرکت نجاح کو ہماری آمد کی اطلاع مل گئی۔ وہ بھاگے بھاگے ملنے کے لیے آئے اور چنگی خانے کے شیڈ میں انتہائی محبت سے بغل گیر ہوئے۔ ہم نے اپنا سارا سامان ایک گاڑی میں رکھا۔ ڈپٹی صاحب کو ایک موٹر میں سوار کرا کے شاہی دارالضیافت میں بھیج دیا، سامان بھی وہیں پہنچ گیا اور ہم دونوں (میں اور اسمٰعیل) منشی احسان اللہ صاحب کی موٹر میں سوار ہو کر ان کے مکان پر چلے

گئے ، ہماری پارٹی اب منتشر ہوگئی۔ حافظ صدیق اپنے رفقا سمیت اپنے معلم کے وکیل کے پاس چلے گئے۔ سیٹھ شکور اپنے ماموں کے مکان پر پہنچ گئے اور ہم دارالضیافت میں جاگزیں ہو گئے۔

منشی صاحب کی دعوتِ طعام:

دوپہر کے کھانے کی دعوت منشی احسان اللہ خاں کے ہاں تھی۔ منشی صاحب ٹھیٹھ پنجابی ہیں۔ اگرچہ مدت مدیدہ سے عرب میں رہنے کی وجہ سے ان کی زندگی ظاہراً بالکل عربوں کی سی ہوگئی ہے لیکن خدا کا شکر ہے کہ نہ وہ پنجاب کو بھولے ہیں اور نہ پنجابی خصایص کی یاد ان کے دل سے محو ہوئی ہے۔ ان کے مکان پر پہنچتے ہی سب سے پہلے ہمارے لیے نہایت عمدہ چھاچھ (یا بہ زبانِ عربی شاشی اور بہ زبانِ پنجابی لَسّی) آئی۔ سیٹھ عبداللہ ہارون کے گھر میں چھاچھ بہ افراط ملتی رہتی تھی۔ لیکن جب سے جہاز پر سوار ہوا تھا اس نعمت سے یکسر محروم ہو گیا تھا۔ آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ میرے جیسے دیہاتی آدمی کے لیے گرمی کے موسم میں چھاچھ کیا حیثیت رکھتی ہے۔ جہاز میں جو کھانا ملتا رہا اس کی کیفیت قبل ازیں پیش کر چکا ہوں۔ بمبئی والوں کے لیے وہ کھانا ہو تو ہو لیکن پنجابیوں کے تعلق میں اسے کھانا کہنا اور کھانا قرار دینا زندگی کی اس سب سے زیادہ ضروری چیز پر کھلا ہوا ظلم ہے۔ کاش میری یہ آواز چاند بھائی عمر بھائی والوں تک پہنچ جائے۔ نیز ہماری خلافت کمیٹی کے ان ارکان تک پہنچ سکے جو حاجیوں کے جہازوں میں کھانے کے انتظام کے بقدر کُل نہیں تو بقدر جزو ضرور ذمہ دار ہیں۔ پھر سمندر کا سفر جس میں انسان اپنی تمام مرغوبات کو جہاز والوں کی مہیا کردہ اشیا کا پابند بنانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ان مصائب عامہ وخاصہ کے بعد جدہ پہنچتے ہی چھاچھ ملی، برف والی نمکین چھاچھ حجاز کی ہنگامہ آرا دوپہر میں ہمارے لیے ابرِرحمت کی طراوش تھی۔ منشی صاحب کا آدمی ایک طاس میں شیشے کے چھ گلاس لگا کر لایا تھا جو ٹھنڈی اور نمکین چھاچھ سے لبریز تھے۔ اسمٰعیل نے سب سے پہلے گلاس اٹھایا اور اس تیزی کے ساتھ گلاس خالی کر کے طاس میں رکھ دیا کہ میرے گلاس اٹھاتے اٹھاتے اسے یہ کہنے کا موقع مل گیا کہ منشی صاحب گلاس چھ ہیں مگر ایک گلاس خالی آیا ہے۔ لیکن منشی صاحب نے میری اور اسماعیل

کی پنجابیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے چھاچھ کا انتظام کیا تھا۔ بلا مبالغہ میں نے پانچ گلاس پیے۔ جی چاہتا تھا کہ اور پیوں، مگر پیٹ میں گنجایش باقی نہ رہی تھی۔ منشی صاحب نے ازراہِ عنایت اپنے آدمی کو حکم دے دیا کہ چھاچھ تیار رکھو تاکہ جب مہمانوں کو پیاس لگے تو چھاچھ پئیں، پانی نہ پئیں۔

عجیب وغریب حقہ:

چھاچھ کے بعد میرے لیے دوسری چیز حقہ ہے۔ منشی صاحب کو میری حقہ نوشی کا علم تھا۔ فی الفور ایک عجیب وغریب حقہ میرے سامنے آ گیا۔ منشی صاحب نے کہا کہ ابھی اسے استعمال کرو۔ تھوڑی دیر میں بڑا حقہ آجائے گا۔ میں نے عمر بھر میں ایسا حقہ نہیں دیکھا تھا۔ اگر اس میں سے نے نکال لی جائے تو حقہ نہیں رہتا بلکہ ایک نہایت خوب صورت آرایشی برتن بن جاتا ہے۔ چلم حقے کے اندر ہے۔ دریافت پر معلوم ہوا کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہے، والی مشہور مثل کا یہ ایک نہایت عمدہ عملی نمونہ ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ نجدی شروع شروع میں حجاز آئے تھے تو سارا حجاز باقاعدہ بھنگڑ خانہ بنا ہوا تھا۔ مرد تو رہے ایک طرف عورتیں بھی دن رات میں دودو روپے کی سگریٹ اُڑا جاتی تھیں۔ نجدیوں کو حقہ کی مخالفت میں خاص امتیاز حاصل ہے۔ انھوں نے مکہ معظمہ اور جدہ پہنچتے ہی قبوں کے ساتھ حقے بھی توڑنے شروع کر دیے۔ اس زمانے میں جدت پسند حجازیوں نے یہ حقہ ایجاد کیا جو منشی صاحب نے میرے لیے منگوایا تھا۔ میں اوّل تو اس کی دِلکش وضع سے مسحور ہوا دوم حجاز کی نجدی حکومت کے ماتحت سفر میں مجھے ایسے حقے کا رکھنا محفوظ معلوم ہوا اس لیے میں نے منشی صاحب سے کہا کہ اس وضع کا ایک حقہ مجھے بھی منگوا دیجیے۔ منشی صاحب نے فی الفور حقہ میرے حوالے کردیا اور آپ کے دفتر نے میرے سامانِ سفر میں جو حقہ رکھا تھا اُسے منشی صاحب کے پاس چھوڑا اور اس نئے حقے کو منشی صاحب کے مکان سے دارالضیافت میں بھیج دیا۔ بعد میں حافظ محمد صدیق صاحب نے یہ حقہ دیکھا تو اسے بہت پسند کیا۔ آخر قرار پایا کہ میں ہندوستان پہنچ کر یہ حقہ حافظ صاحب کے پاس دہلی بھیج دوں اور وہ اس کے ساتھ کے متعدد حقے مراد آباد سے بنوائیں، جن میں سے کم از کم دو عمدہ حقے مجھے عنایت فرمائیں۔

حافظ صاحب نے حسبِ عادت مسکرا کر میری یہ درخواست قبول کر لی، مراد آباد میں میرے بھی دوست ہیں۔ مثلاً عبدالواحد، محمد اکبر صاحبان تاجر ظروف، لیکن میں نے مناسب یہی سمجھا کہ حقے کے معاملے میں صرف حافظ محمد صدیق صاحب سے مدد مانگنا جائز ہے اور کسی ایسے موحد بھائی یا بزرگ سے مدد مانگنا جائز نہیں، جن کے نزدیک حقہ مرغوب شے نہیں۔

مکہ معظّمہ کی طرف روانگی:

حقے کی بحث میں بات کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔ میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ منشی احسان اللہ صاحب نے ہماری تواضع میں محبت اور خلوص کی کوئی منزل باقی نہ چھوڑی۔ چھاچھ پلائی، حقہ پلایا، پھر چھاچھ پلائی۔ بعد ازاں کھانا دستر خوان پر چنا گیا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہندوستان کے دو مسکین مہر اور اسماعیل مہمان ہیں۔ اس شانِ اہتمام کے ساتھ ساتھ منشی صاحب بار بار فرما رہے تھے کہ اہل وعیال مکہ معظمہ میں ہیں اس لیے میزبانی کا حق ادا نہیں ہو سکا۔ کھانا کھا چکنے کے بعد آیندہ پروگرام کا مسئلہ سامنے آیا۔ سیٹھ شکور اپنے آپ کو اپنے ماموں کے حوالے کر کے بے اختیار ہو چکے تھے لیکن حافظ صدیق صاحب نے معلم کے حوالے ہو چکنے کے باوجود عنانِ اختیار اپنے قبضے میں رکھی تھی۔ ہم نے منشی صاحب کے ہاں سے انھیں فون کیا کہ کیا ارادہ ہے؟ فرمانے لگے کہ جو فیصلہ کرو مجھے اس سے مطلع کر دینا۔ منشی صاحب فرماتے ہیں کہ ۳رمئی کی شام کو میرے ساتھ مکہ معظمہ چلو۔ میں اس تجویز کا موید تھا۔ لیکن اسمٰعیل ۲رمئی کی شام ہی کو چلنے پر مصر تھا۔ اس اثنا میں اطلاع ملی کہ ۳رمئی کی صبح کو سلطان المعظم جدہ تشریف لا رہے ہیں اور انھیں نجد سے حجاز آئے ہوئے تین ہی دن گزرے ہیں۔ یہ خبر سن کر میں اسمٰعیل کا موید بن گیا اس لیے کہ اگر ہم جدہ میں ٹھہر جاتے تو حضرت سلطان المعظم کے جدہ میں تشریف فرمارہنے تک مکہ معظمہ جانا معیوب معلوم ہوتا تھا۔ بہتر یہی معلوم ہوا کہ اعلیٰ حضرت کے جدہ آنے سے قبل ہم مکہ معظمہ پہنچ کر عمرہ سے فارغ ہو جائیں۔ منشی صاحب نے اسی شرط پر جانے کی اجازت دی کہ ہم مکہ معظمہ میں اور منیٰ وعرفات میں ان کے مہمان رہیں، جانے کا فیصلہ ہو گیا تو ہم نے حافظ صدیق صاحب

کوفون پر اطلاع دے دی۔ انھوں نے بھی اپنے لیے اور اپنے رفقا کے لیے فی الفور سواری کا بندوبست کر لیا۔ ہمارے سامان لے لیے ایک لاری اور سواری کے لیے ایک موٹر کا انتظام ہو گیا۔ ہم منشی صاحب کے ہاں سے اُٹھ کر دارالضیافت میں گئے۔ بعد ازاں شیخ عبداللہ علی رضا گورنر جدہ اور شیخ محمد لطیف رئیس جدہ سے ملے۔ شام کا کھانا دارالضیافت میں کھایا۔ حافظ محمد صدیق صاحب شام تک تیار ہو چکے تھے۔ لیکن ہماری تیاری میں تاخیر ہوگئی۔ ہم نے حافظ صاحب کو جبراً اُن کے رفقا سے علیحدہ کر لیا اور کہا کہ آپ ہمارے ساتھ مکہ معظّمہ چلیں۔ چنانچہ ان کے رفقا شام ہی کو روانہ ہو گئے اور ہم رات کے گیارہ بجے سے قبل روانہ نہ ہو سکے۔ اس دوران میں خلیفہ محمد حسین صاحب ہمارے ساتھ رہے۔ منشی صاحب کی طرف سے تاکید تھی کہ جانے سے قبل انھیں فون پر اطلاع دی جائے۔ ان کا ارادہ تھا کہ دور تک ہمارے ساتھ جائیں۔ گیارہ بجے ہم ان سے ملنے کے لیے گئے تو وہ حاجیوں کے انتظام میں مصروف تھے اور دفتر میں بیٹھے تھے۔ وہاں ہم تھوڑی دیر بیٹھے رہے۔ بہ اصرار منشی صاحب کو معیت سے روکا اور لبیک اللھم لبیک کہتے ہوئے مکہ معظّمہ کی طرف چل پڑے۔

حافظ صاحب کے آم:

میں یہ بتانا بھول گیا کہ حافظ صاحب آموں کی دو بڑی بڑی پیٹیاں اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ ایک پیٹی ان کے اپنے استعمال کے لیے تھی اور دوسری پیٹی شرکت نجاح والوں کے لیے اور بعض دیگر احباب کے حصے کے لیے تحفہ تھی۔ میں نے عرض کیا کہ ایک سالم پیٹی مجھے بھی مل جانی چاہیے اس لیے کہ میں شرکت نجاح والوں کے حصے کا بھی حصہ دار ہوں اور آپ کے (حافظ صاحب) کے حصے کا بھی۔ میں نے یہ بھی کہہ دیا کہ آپ شرکت نجاح والوں سے پوچھ لیں۔ وہ میرے اس حق کو بہر حال تسلیم کریں گے۔ اس پر ہمارے حلقے میں بڑی دیر تک خندہ زنی کا تموج جاری رہا۔ لیکن افسوس کہ سفر کی دوڑ دھوپ میں مجھے پورا حصہ نہ مل سکا اور محض حافظ صاحب کے حصے میں سے کچھ آم مکہ معظّمہ پہنچ کر ملے، جو وہاں

احباب میں تقسیم کر دیے گئے۔

راستے کی کیفیت:

ہم رات کے بارہ بجے کے قریب جدہ سے روانہ ہوئے۔ رات کی تیرگی میں راستے کی پوری کیفیت معلوم نہ ہو سکی۔ لیکن عام طور پر معلوم ہوتا تھا کہ ۱۹۲۶ء کے مقابلے میں حالت بہتر ہے۔ اگر چہ پختہ سڑک اب تک نہیں بن سکی اور جن جن مقامات پر ریت ہے وہاں سفر بے حد تکلیف دہ بن جاتا ہے۔ چوں کہ حاجیوں کی کثرت کے باعث آمد و رفت کا سلسلہ زوروں پر ہے اس لیے گرد بھی بے حد اُڑتی ہے۔ راستے میں جابجا قہوہ خانے بنے ہوئے ہیں جن میں پانی، قہوہ، چائے اور کھانے کی عام چیزیں ملتی ہیں۔ تکرونی یعنی سوڈانی لوگ اکثر و بیشتر پیدل سفر کرتے ہیں۔ وہ سوڈان سے جہاز پر یا بڑی کشتی پر سوار ہو کر آجاتے ہیں۔ ان کا سامان بہت مختصر ہوتا ہے۔ مثلاً کھجور یا تاڑ کے درخت کی چند شاخیں، چند کپڑے، تام چینی کی ایک کیتلی (جس سے وہ لوٹے کا کام بھی لیتے ہیں اور چائے کی کیتلی کا بھی) آرام کے اوقات میں عموماً پہاڑوں پر چڑھ جاتے ہیں اور بڑے بڑے پتھروں کی اوٹ میں کھجور یا تاڑ کی شاخیں کھڑی کر کے اُوپر کپڑا تان لیتے ہیں۔ یہی ان کا خیمہ ہوتا ہے ہر شخص دھوپ کے وقت اپنے خیمے میں آرام کرتا ہے اور رات کے اوقات میں (جو اُن کے سفر کا عام وقت ہے) پیدل سفر کرتا ہے۔ ہم نے سفر کے دوران میں بہت سی پارٹیوں کو پیدل چلتے دیکھا، بلکہ کہنا چاہیے، جدہ سے مکہ تک ایک لمحہ کے لیے بھی ان کا سلسلہ منقطع نہ ہوا۔ چند منٹوں کے لیے جدہ اور بحرہ ٹھہرتے ہوئے ہم تین بجے کے قریب مکہ معظمہ پہنچ گئے۔ حج کے ایام میں حاجیوں کی موٹروں کو مکہ معظمہ کے بیرونی محلے جرول میں روک دیتے ہیں اور شہر کے اندر نہیں جانے دیتے۔ وہاں پہنچتے ہی ہر حاجی کے معلم کا نام پوچھا جاتا ہے اور پھر ایک آدمی بلند آواز سے معلم کا نام پکارتا ہے اور معلم کا آدمی پہنچ کر حاجی کو سنبھال لیتا ہے۔ حاجی عموماً سامان معلم کے حوالے کر دیتے ہیں اور خود پیدل حرم میں یا معلم کے مکان میں پہنچ جاتے ہیں۔ سامان خچروں کی گاڑیوں میں رکھ کر جنھیں عربیہ کہتے ہیں یا اونٹوں پر لاد

کر مکانوں تک پہنچایا جاتا ہے۔ ہمارے ساتھ جدہ سے حکومت کا ایک آدمی آیا تھا اس لیے ہماری موٹر اور لاری کے لیے شہر کے اندر جانے کی اجازت مل گئی اور ہم ساڑھے تین بجے دارالکسوہ میں پہنچ گئے جو ہماری مجوزہ قیام گاہ تھی۔

حرمِ پاک میں:

جاتے ہی میں نے غسل کیا۔ حافظ صاحب کی طبیعت راستے میں بہت خراب ہوگئی تھی لیکن وہ بھی فی الفور وضو کر کے ارکانِ عمرہ ادا کرنے کے لیے تیار ہوگئے۔ اسماعیل اور ڈپٹی صاحب نے بھی وضو کر لیا اور ہم حرم کی طرف روانہ ہوگئے۔ دارالکسوہ حرم پاک سے قریب ہے۔ چند منٹ میں باب السلام سے ہم حرم میں داخل ہوئے۔ ۱۲/جنوری ۱۹۲۶ء کو میں نے طواف وداع کیا تھا۔ تقریباً چار سال کے بعد پھر میری آلودہ معصیت نگاہیں اس مقدس گھر پر پڑیں جو اس کائنات کا افضل ترین مقام ہے اور جو دن میں پانچ مرتبہ کروڑوں پیشانیوں کا نقطۂ ماسکہ بنتا ہے۔ ہم باب السلام سے داخل ہو کر بیت اللہ کی طرف بڑھے تو زبان پر یہ دُعا جاری تھی: "اللھم زِد ھذا البیت تَشرِیفًا وَّ تَعظِیمًا وَّ تَکرِیمًا وَّ مَھَابَۃً وَّزِدْ مِنْ زَار ھذا البیت تَشرِیفًا وَّ تَعظِیمًا وَّ تَکرِیمًا وَّ مَھَابَۃً" حرم پاک کے صحن میں ہزاروں حاجی سوئے ہوئے تھے، صدہا طواف میں مشغول تھے۔ جاتے ہی ہم نے حجرِ اسود کے سامنے کھڑے ہو کر طواف عمرہ کی نیت کی۔ طواف کیا، سات شواط ختم کر کے ملتزم کو پکڑ کر دعائیں مانگیں، پھر مقام ابراہیم پر دوگانہ طواف ادا کیا اور زم زم پی کر باب الصفا سے کوہِ صفا پر پہنچے۔ اس وقت تک نماز فجر کی پہلی اذان ہو چکی تھی۔ مسعیٰ (صفا و مروہ کے درمیان سعی کی جگہ) بھی سعی کرنے والوں سے لبریز تھا۔ ہر شخص کی زبان پر دُعا جاری تھی اور اللھم اللھم کے سوا کوئی صدا سنائی نہیں دیتی تھی۔ (انقلاب: ۱۴/جون ۱۹۳۰ء ص ۲،۳)

دوامِ ذکر و دُعا:

اللہ اکبر! کتنا پاک مقام ہے۔ کتنی مقدس دُعائیں مانگی گئی ہیں۔ کتنا مزکّیٰ خطہ ہے۔ ساڑھے تیرہ سو سال کی مدت میں اس مقام پر اللہ تعالیٰ کو جس درجہ یاد کیا گیا ہے اور اس کی

بارگاہ میں عاجزی کے ساتھ جس قدر دعائیں مانگی گئی ہیں، دُنیا کی کسی عبادت گاہ میں نہیں مانگی گئیں۔ بلکہ میرا دعویٰ تو یہ ہے کہ ساری دنیا کی عبادت گاہوں کے ذکروں اور دعاؤں کو ملا کر بھی بیت اللہ کے ذکر و دعا کے مقابلے میں پیش نہیں کیا جاسکتا۔ عرب کے موسم گرما کی تن سوز دوپہر ہو یا دُنیا و مافیہا کے سکون و آرام کی تیرہ و تار راتیں ہوں، بیت اللہ کا دامن ذاکروں کی نداؤں سے اور مطاف طائفین کے ذکر و دُعا سے کبھی خالی نہیں ہوا۔ یہ شرف اور کس مقام کو حاصل ہے؟ محی الدین ابن عربی کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ دس سال حرم پاک میں اس انتظار میں رہے کہ انھیں تنہا طواف کا موقع مل جائے۔ دس سال میں صرف ایک مرتبہ ایسا موقع ملا اور جس حد تک طواف کا تعلق ہے، ظاہر ہے کہ حرم پاک کو شیخ محی الدین کے طواف تنہائی میں بھی خالی نہیں کہا جا سکتا۔ یہ ہے حرم پاک کی عظمت کا مقام تکریم و تعظیم، یہ ہے حرم پاک کی برتری! ہم نے سعی ختم کی، بال کٹوائے، عمرہ پورا ہو گیا اور ہم نے احرام کے کپڑوں ہی میں نماز صبح جماعت کے ساتھ حرم پاک میں ادا کی۔

مَردانگی پشہ:

شب بھر کی بیداری اور تکلیف دہ سفر کی وجہ سے طبیعت بہت خراب ہو گئی تھی۔ حافظ صاحب تو صبح کی نماز کے بعد اپنے رفقا کے انتظار میں حرم ہی میں ٹھہر گئے اور ہم سب دارالکسوہ میں آکر سو گئے لیکن ابھی آنکھ لگی ہی تھی کہ مچھروں کا بے پناہ حملہ ہو گیا۔ ذوقؔ کے شعر مجھے کبھی یاد نہیں رہے اور نہ ان کے یاد رکھنے کی آرزو کبھی دل میں پیدا ہوئی۔ مولانا ابوالکلام کے قول کے مطابق ذوقؔ کے اشعار میں ہمارے ذوق کے باتیں تقریباً ناپید ہیں لیکن مچھروں کے مذکورہ حملے کے وقت ان کا ایک شعر بے اختیار یاد آ گیا ؎

پشہ سے سیکھے شیوۂ مَردانگی کوئی   جب قصدِ خون کو آئے تو پہلے پکار دے!

ذوقؔ کا تجربہ ممکن ہے درست ہو لیکن مجھے تو پشوؤں کی نامردگی پر غصہ آیا کہ کم بخت شب بیداری کے مارے ہوئے غریب مسافروں کو بھی آرام نہیں لینے دیتے۔ دارالکسوہ کی ساری فوج دو مسکینوں پر ٹوٹ پڑی ہے۔ انسان سویا ہوا ہو تو اُس وقت کی مدھم سی ٹیں ٹیں کے متعلق یہ کہنا کہ "جب قصدِ خون کو آئے تو پہلے پکار دے" اور اس پر مچھر کی مردانگی کی بنیاد

رکھنا صرف ذوق ایسے عجیب الفکر شاعر ہی سے ممکن ہے۔

دوستوں سے مُلاقاتیں:

بہر حال ایک گھنٹے میں آنکھ کھل گئی۔ خواجہ غلام محمد سیکرٹری خلافت کمیٹی لینے کے لیے آگئے۔ خواجہ صاحب ہم سے پہلے مکہ معظمہ پہنچے تھے اور دارالکسوہ میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ خواجہ صاحب نے بتایا کہ خان محمد خان صاحب مدیر الکسوہ رات دیر تک انتظار کرتے رہے۔ تھوڑی دیر میں خان صاحب کا صاحب زادہ مصباح الدین آگیا۔ جو مشلح، مندیل اور عقال پہن کر پورا نجدی بنا ہوا تھا۔ مولانا عبدالرحمٰن ہزاروی آگئے۔ پروفیسر عبدالحی عرب استاد العربیہ فی کلیۃ آکسفورڈ (انگلستان) سے ملے جن کے متعلق مفصل ذکر آگے چل کر آئے گا۔ حضرت مولانا عبید اللہ صاحب مہاجر صاحب نظارۃ المعارف القرآنیہ (دہلی) آگئے، جنھوں نے ۱۹۱۵ء میں ہندوستان چھوڑا تھا اور اب تین چار سال سے مکہ معظمہ میں مقیم ہیں۔ حضرت مولانا انتہائی محبت اور شفقت سے ملے۔ فرمانے لگے کہ اخبار میں تمھاری تحریریں مدت سے پڑھ رہے تھے، ملاقات کی آرزو تھی۔ ۱۹۲۸ء سے سُن رہا تھا کہ تم آؤ گے، مگر نہ آئے، انتظار کرا کرا کے اب آئے ہو۔ حضرت مولانا جس زمانے (۱۹۱۵ء) میں ہندوستان سے باہر نکلے تھے، میں کالج میں پڑھتا تھا۔ ایک مرتبہ حضرت موصوف مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھ راولپنڈی کی کانفرنس سے واپسی پر لاہور میں ٹھہرے تھے تو میں نے برگنیزا ہوٹل میں مولانا آزاد کے پاس ان کی زیارت کی تھی۔ اس وقت سے حضرت ممدوح کی شکل وصورت کا دُھندلا سا خاکہ ذہن میں محفوظ تھا۔ آرزو تھی کہ اللہ تعالیٰ ملاقات کا موقع عطا کرے گا تو حضرت ممدوح سے ان کی پوری داستانِ حیات سنوں گا۔ ہم جتنے دن مکہ معظمہ میں رہے حضرت مولانا سے بالالتزام اکثر اوقات دو مرتبہ اور بہ درجہ اقل ایک مرتبہ ملاقات ہوتی رہی۔ بہت سی باتیں سنیں بہت سے تذکرے سنے، جنھیں ان شاء اللہ الگ بیان کروں گا۔ علی الخصوص مولانا کی زندگی کے بعض اہم واقعات!

آٹھ نو بجے کے قریب خان محمد صاحب گھر سے آگئے۔ وہ بھی اب مشلح، مندیل اور عقال پہن کر عرب بنے ہوئے تھے۔ پانچ سال کے بعد ان سے معانقے کا شرف حاصل

ہوا۔ مختلف باتیں ہوتی رہیں لیکن میں ان میں زیادہ حصہ نہ لے سکا، اس لیے کہ میری طبیعت بہت خراب تھی۔

منشی احسان اللہ کی دعوتیں:

سلطان المعظم تین مئی کو جدہ نہیں گئے تھے لیکن ہم سفر کی کوفت کے باعث سلام کے لیے حاضر نہ ہو سکے۔ ۴؍مئی کی صبح کو معلوم ہوا کی اعلیٰ حضرت صبح کی نماز کے بعد حرم میں طواف کر کے جدہ چلے گئے ہیں۔ ۵؍مئی کی شام کو تشریف لے آئیں گے۔ اسی وقت خواجہ غلام محمد صاحب نے بتایا کہ حضرت قاضی محمد سلیمان صاحب منصور پوری مصنف رحمۃ للعالمین (جو اس سال دوبارہ حج کے لیے تشریف لائے ہوئے ہیں) کی طبیعت ناساز ہے، لہٰذا میں ان کی مزاج پُرسی کے لیے چلا گیا اور ایک گھنٹہ ان کے پاس بیٹھا رہا۔

بعض دیگر احباب سے ملا جن میں سے باب السلام کے تاجر کتب شیخ ابراہیم ہندی اور شیخ نواب علی ہندی کے اسما خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، پھر حافظ محمد صدیق صاحب کے مکان پر چلا گیا جو دارالکسوہ سے قریب ہے۔ حافظ صاحب نے سات پونڈ کرایہ دے کر یہ مکان چندا ایام کے لیے لیا ہے۔ دوپہر کا کھانا میں نے وہیں کھایا۔ دارالکسوہ میں پہنچا تو معلوم ہوا کہ منشی احسان اللہ صاحب کی موٹر دو مرتبہ آچکی ہے، منشی صاحب ۳؍مئی کی رات کو مکہ معظّمہ آگئے تھے۔ ۴؍مئی کی صبح سے ہمارے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ انھیں فون کیا گیا تو تیسری مرتبہ موٹر بھیج دی۔ میں اسماعیل اور ڈپٹی صاحب موٹر میں بیٹھ کر منشی صاحب کے مکان پر گئے۔ جہاں ڈاکٹر عبدالمجید صاحب اور بعض دوسرے احباب سے ملاقات ہوئی۔ میں کھانا کھا چکا تھا، اسماعیل اور ڈپٹی صاحب نے کھانا کھایا۔ میں نے چھاچھ پی اور حقہ پیا۔ منشی صاحب مستقل مہمانی کے لیے مصر تھے۔ ہم نے ان کے اصرار پر روزانہ دوپہر کا کھانا منظور کر لیا۔ چنانچہ ان کے قیامِ مکہ کے دوران روزانہ دوپہر کے وقت موٹر ہمارے پاس پہنچ جاتی اور ہم کھانا منشی صاحب کے ہاں کھاتے۔

اسماعیل کے مشاغل:

مکہ معظّمہ پہنچتے ہی اسماعیل عملاً مجھ سے علیحدہ ہو گیا، وہ تقریباً چوبیس گھنٹے میرے ساتھ

رہتا مگر حقیقۃً چند منٹ بھی میرے ساتھ نہ ہوتا، ہر وقت خاص وضع کے حاجیوں کا جمگھٹ اس کے گرد و پیش لگا رہتا۔ کسی کا عزیز بیمار ہے کسی کو ڈاکٹر نہیں ملتا، کسی کو معلم تنگ کر رہا ہے، کوئی مدینہ جانے کا قبل از وقت انتظام کرانا چاہتا ہے، کسی کو داخلہ بیت کی ضرورت ہے، کوئی حضرت سلطان المعظم سے ملاقات کا آرزو مند ہے، زیادہ تر وہ لوگ آتے تھے جن کے لیے حافظ محمد صدیق نے نہایت عمدہ نام وضع کیا تھا یعنی من استطاع الیہ سبیلاً کی خلاف ورزی کرنے والوں کا گروہ، یہ لوگ آتے اور کہتے۔ مولانا (اسمٰعیل) کراچی میں رعایتی ٹکٹ تو آپ نے دلا ہی دیا تھا، اس طرح ہم مکہ معظمہ پہنچ کر فریضہ حج سے سُبک دوش ہو گئے! اب ضروری ہے کہ معلم سے معلّی کی فیس بھی معاف کرادیجیے نیز مدینہ پہنچا دیجیے، دعائیں دیں گے۔ ظاہر ہے کہ اسماعیل کے پاس اتنی دولت نہ تھی کہ دس بیس ہزار مسکین حاجیوں کو بارہ پونڈ یا سولہ پونڈ فی کس کے حساب سے مدینہ منورہ کا کرایہ دے دیتا۔ وہ کہتا کہ بھائی فرض ادا ہو چکا ہے میں جو کچھ کرسکتا تھا کر چکا۔ اب آپ جانیں اور آپ کا کام یہ جواب سن کر اکثر و بیشتر حاجی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتے۔ اسمٰعیل کی طرف سے بلا تامل مجھے حکم مل جاتا اس کو پانچ روپے دے دو۔ اس کو دس روپے دے دو۔ ایک شخص کو معلم کی فیس کے سلسلے میں دس روپے دیے اور کہا کہ باقی روپے اپنے پاس سے ڈال لینا اور فیس ادا کر دینا۔ دوسرے روز معلوم ہوا کہ اُس اللہ کے بندے نے اسماعیل والے روپوں کے علاوہ صرف چار روپے دیے (حالانکہ اسے کم از کم پونے سات روپے دینے چاہئیں تھے) اور کہہ دیا کہ مولوی صاحب نے (اسماعیل نے) مجھے یہی دیے تھے۔ ایک روز حاجی صدیق صاحب نے یہ حالت دیکھی تو سو روپے کے نوٹ لفافے میں بند کر کے ایک آدمی کے ہاتھ اسماعیل کے پاس بھیج دیے اور ساتھ رقعہ لکھ دیا کہ "من استطاع الیہ سبیلاً" کے حاجیوں کی امداد کے لیے ہیں۔

دعوتِ سلطانی:

۵ رمئی کو سلطان المعظم کی طرف سے اکابر حجاج اور اکابر ارکانِ حکومت کی دعوت تھی۔ اس دعوت میں کم وبیش پانچ سو اصحاب شریک ہوئے۔ اسمٰعیل اور قاضی سلیمان صاحب منصور

پوری بوجہ ناسازیٔ طبع شریک نہ ہو سکے۔ حکم یہ تھا کہ تمام مدعوین شام کے وقت حمیدیہ (ادارہ حکومت مرکزیہ حجاز) پہنچ جائیں۔ وہاں آٹھ دس موٹریں موجود تھیں، جو مدعوین کو قصرِ شاہی میں پہنچا رہی تھیں۔ میں خان محمد خان اور حافظ محمد صدیق صاحب دہلوی اکٹھے گئے۔ ڈپٹی صاحب، پروفیسر عبدالحی صاحب عرب وغیرہ پہلے جا چکے تھے۔ ملاقات کے بڑے کمرے میں جو قصر کی دوسری منزل میں ہے، حضرت سلطان المعظم تشریف فرما تھے۔ چوں کہ ہم سب سے آخر میں پہنچے تھے اس لیے حضرت سلطان سے مصافحہ کے لیے آگے نہ بڑھ سکے۔ ہمارے پہنچنے کے پانچ منٹ بعد سلطان المعظم اٹھے۔ ان کے ساتھ ہی سب لوگ اٹھے۔ کھانے کی میزیں کمروں میں قصر کے صحن میں لگی ہوئی تھیں۔ کھانا بے حد پر تکلف تھا۔ ہم کھانا کھا رہے تھے کہ ہمارے پاس سے امیر سعود ولی عہد مملکت نجد وحجاز گزر رہے۔ میں نے انھیں یہیں پہلی مرتبہ دیکھا۔ چونکہ کھانا کھا رہے تھے اس لیے ان سے مصافحہ نہ کر سکے۔ کھانے سے فارغ ہو کر تمام مہمان محل کی تیسری منزل کے ایک مسقف کمرے میں بیٹھ گئے۔ اس دوران میں شیخ عبداللہ سلیمان وزیر مال ہمارے پاس آئے۔ میں ان سے ۱۹۲۵ء میں متعدد بار مل چکا تھا۔ لیکن اب نہ میں نے انھیں پہچانا نہ وہ مجھے پہچان سکے۔ خان محمد خان صاحب نے تعارف کرایا تو وہ محبت اور تپاک سے ملے اور مجھے اور خان صاحب کو اٹھا کر سلطان المعظم کے قریب کرسیوں کی سب سے پہلی قطار میں لے گئے۔ میرے دائیں ہاتھ مصری قونصل تھا اور بائیں ہاتھ جامع زین العابدین مصر کا خطیب۔ سلطان المعظم میرے سامنے۔ سوا چار سال کے بعد اب پہلی مرتبہ حضرت سلطان کو قریب سے دیکھا۔ وہی سادہ لباس، وہی سادہ عبا، پاؤں میں وہی نجد کی چپلی۔

سلطان المعظم:

چند منٹ کے بعد سلطان المعظم نے تقریر شروع کی اور آیہ خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ[1] تلاوت

[1] سورہ حجرات کی آیت نمبر ۱۳، ترجمہ: ''اے لوگو! ہم نے دنیا میں تمھاری خلقت کا وسیلہ مرد اور عورت کا اتحاد رکھا اور نسلوں قبیلوں میں تقسیم کر دیا۔ اس لیے کہ باہم پہچانیں (ورنہ اصل میں یہ تفریق و انتساب کوئی ذریعہ امتیاز نہیں) اور امتیاز و شرف اسی کے لیے ہے جو اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ متقی ہے

فرمانے کے بعد کلمۂ توحید کی تشریح فرمانے لگے۔توحید اہل نجد کا خاص مضمون ہے۔ پھر سلطان کا زورِ کلام، خطابت کی بے پناہ سحر کاریاں، اسلام کا جوش، دین کی محبت، پانچ منٹ کے اندر اندر پانچ سو کا متفرق الاقوام مجمع ہمہ تن اس سحر حلال کی موجوں میں غرق ہو چکا تھا۔ سلطان نے اہلِ نجد کے عقاید بیان فرمائے۔کہا کہ ہم قرآن وحدیث، ارشاداتِ صحابہ کرام اور اجتہاداتِ ائمہ اربعہ تک ہر چیز کو علی الترتیب مانتے ہیں۔ ان میں سے جو چیز ہمارے سامنے آئے، سر آنکھوں پر۔لیکن ان کے بعد کچھ نہیں مانتے۔ آخر میں اتحاد المسلمین پر بڑا زور دیا۔ بار بار فرماتے تھے، کہ مسلمان متحد ہوئے بغیر باقی نہیں رہ سکتے۔ یہ بھی فرمایا کہ لوگ مجھے یورپ سے ڈراتے ہیں، میں دُنیا کی ہر چیز سے بے پروا ہوں۔ خدا اور رسول صلّی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی شے کے سامنے میری گردن نہیں جھک سکتی۔ جہاں خواجہ دو جہاں حضور صلّی اللہ علیہ وسلم کا نامِ مبارک آتا، سلطان اللھم صلّی وسلم علیہ پڑھتے۔ یہ پُر تاثیر تقریر تقریباً ایک گھنٹے تک جاری رہی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کی کوئی نہایت زبردست عالمِ دین توحید کے حقایق عالیہ کو نہایت پُر تاثیر انداز میں پیش کررہا ہے۔ آخر میں سلطان نے ازرہِ عجز و انکسار فرمایا کہ میں پڑھا لکھا آدمی نہیں ہوں، محض بدّو ہوں۔شاید قرآن کی چند آیتیں بھی صحیح نہیں پڑھ سکتا لیکن اللہ نے مجھے توحید کی حفاظت کا منصب عطا کیا ہے۔ میری اولاد، میرا گھر بار، میری قوم اور میرا ملک، سب اس راہ میں قربان ہو جائیں، میں بلا تامّل قربان کر ڈالوں گا لیکن اپنا منصب ضرور پورا کروں گا۔

تقریر پوری ہو چکی تو ہر طرف سے سپاس و دُعا کی صدائیں بلند ہوئیں۔ ہمارے محترم بزرگ پروفیسر عبدالحی عرب صاحب نے اُٹھ کر حضرت سلطان المعظم سے عرض کی کہ مجمع میں متعدد ہندوستانی، ایرانی اور افغانی موجود ہیں جنھوں نے تقریر کا پورا مطلب نہیں سمجھا۔ اگر اجازت ہو تو میں اس کا خلاصہ اُردو اور فارسی زبان میں سنادوں۔ حضرت سلطان نے ارشاد فرمایا کہ مضائقہ نہیں۔ پروفیسر صاحب نے ساری تقریر کا خلاصہ پہلے اُردو اور پھر فارسی میں حاضرین کو سنایا۔ پروفیسر صاحب کے بعد شمس العلما مولانا سید احمد صاحب امام جامع

مسجد دہلی نے اُردو میں حضرت سلطان کا شکریہ ادا کیا۔ پروفیسر عبدالحی نے امام صاحب کی تقریر کا ترجمہ کیا۔ پھر مصری علما نے تشکر کی تقریریں کیں۔ آخر میں جامعۂ زین العابدین کے خطیب نے تقریر کی، بے حد تعریف کی اور کہا کہ مجھے حضرت سلطان کی تقریر سننے کا یہ دوسرا موقع ملا ہے (اس سے قبل حضرت سلطان نے بلدیۂ مکہ معظمہ کی دعوت میں تقریر فرمائی تھی، جس کا مفصل ذکر آگے آتا ہے۔ یہ دعوت ہمارے آنے سے ایک روز قبل ہو چکی تھی) میں حیران ہوں کہ ایک والیٔ ملک کس طرح ایسی لبریز حقائق تقریریں کر سکتا ہے۔ میں جلالۃ الملک کو مرشد الحکیم کہوں تو بے جا نہ ہوگا آخر میں شعرا نے چند قصیدے پڑھے اور مجلس ختم ہو گئی۔ میں نے خاتمہ مجلس پر پروفیسر عبدالحی عرب کے ساتھ جا کر سلطان سے مصافحہ کیا۔ مزاج پرسی کے بعد ارشاد فرمانے لگے کہ ان شاء اللہ حج کے بعد مفصل ملاقاتیں ہوں گی۔ بعد ازاں میں، خان صاحب، حافظ صدیق صاحب اور ڈپٹی صاحب منشی احسان اللہ خاں کی موٹر میں بیٹھ کر دارالکسوہ آگئے

بلدیہ مکہ کی دعوت:

میں اوپر عرض کر چکا ہوں کہ سلطان المعظم نے ہمارے مکہ پہنچنے سے ایک روز قبل بلدیہ کی دعوت میں ایک نہایت دل کش تقریر فرمائی تھی۔ اس کی کیفیت یہ ہے کہ بلدیۂ مکہ نے سلطان کے مکہ معظمہ پہنچنے سے دوسرے روز سلطان کے اعزاز میں ایک عالی شان دعوت کا انتظام کیا تھا جس میں متعدد اکابر شریک تھے۔ یہ دعوت دارالموتمر واقع جیاد میں ہوئی تھی، جواب حکومت کا دفتر مال ہے۔ سلطان پچھلے سال حج سے فارغ ہوتے ہی بعض قبائلِ نجد کی بغاوت کے باعث نجد تشریف لے گئے تھے اور حضرت کو سال بھر حجاز آنے کی فرصت نہیں ملی تھی۔ ان کی غیر حاضری میں بعض کوتاہ اندیش اصحاب کی تحریک پر حجاز میں سلطان کا یوم جلوس منایا گیا۔ جس میں من جملہ دوسری باتوں کے عربیت کے احیا پر خاص زور دیا گیا اور مصری و شامی اخبار نویسوں کو خاص طور پر بلایا گیا۔ سُنا گیا ہے کہ اس جشن میں زندہ باد ملت عرب کے نعرے خاص طور پر لگائے گئے تھے۔ سلطان کو نجد میں یہ تمام کوائف معلوم ہوئے تو انھیں بڑا غصہ آیا کہ میں اسلام کے لیے جان ہتھیلی پر لیے پھرتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ

اسلام کے سوا ہر امتیاز مٹ جائے۔ لیکن میرے کارکن "زندہ باد ملتِ عرب" کے پیچھے پڑ گئے ہیں اور میری تحریک کو اسلامیت کے صراطِ مستقیم سے ہٹا کر یورپی، افریقی وقومیت کے غلط راستے پر ڈال رہے ہیں۔

زِندہ باد اِسلام:

چنانچہ سلطان نے مکہ معظمہ پہنچنے کے بعد سب سے پہلی پبلک تقریر میں افرنجی قومیت کے اس بُت کو ریزہ ریزہ کرنا ضروری سمجھا جسے سلطان کی غیر حاضری میں بعض کوتاہ اندیشوں نے حرمین میں کھڑا کرنے کی کوشش کی تھی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ سلطان نے غیظ آمیز انداز میں تحریک جدیدۂ عربیت کی خرابیاں واضح کیں، فرمایا تم کہتے ہو کہ ہم عرب ہیں۔ لیکن عربوں نے کیا کیا؟ تم وہ نہیں ہو جن کے آباو اجداد نے اس کاینات کی محبوب ترین ہستی کو اذیت دی تھی اور اس وطن سے نکل جانے پر مجبور کر دیا تھا؟ صلّی اللہ علیہ وسلم کیا ان ہی عربوں نے بیت المقدس کو بتوں سے نہیں بھرا تھا؟ دین قیم کی مخالفت نہیں کی تھی؟ کیا ابوجہل اور ابولہب عرب نہ تھے؟ تم جس شے پر نازاں ہو، جس چیز پر فخر کر رہے ہو کیا وہ اسلام سے قبل دُنیا کی ملعون ترین چیز نہ تھی؟ لہٰذا شرف عربیت سے نہیں، اسلام سے ہے، تم اس لیے معزز بنے کہ تم نے اسلام کا جھنڈا بلند کیا۔ پھر اب تمھاری زبانوں پر "زندہ باد عرب مِلّت" کیوں ہے؟ کیوں زندہ باد اسلام نہیں پکارتے۔ عربوں کو اسلام کے سوا کوئی رعایت حاصل نہیں ہے اور یہ شرف ایسا ہے جس میں کاینات انسانیت کا ہر فرزند توحید، ہر کلمہ گوے حق ان کا ہم پایہ ہے۔ خواہ افغانستان کا رہنے والا ہو یا ایران کا، مصر کا رہنے والا ہو یا ہندوستان کا تمہاری زبان پر صرف ایک کلمہ ہونا چاہیے یعنی زندہ باد اسلام! اسلام تمھارا مبدا ہے اسلام تمھارا معاد ہے۔ اس سے تمھیں شرف ہے، اس سے تمھیں برتری ہے۔ عربیت ہیچ ہے اسلام کے بغیر سب کچھ ہیچ ہے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ اس تقریر نے سب کی آنکھیں کھول دیں اور سب اپنی جاری کردہ تحریک پر نادم تھے۔

احرامِ حج:

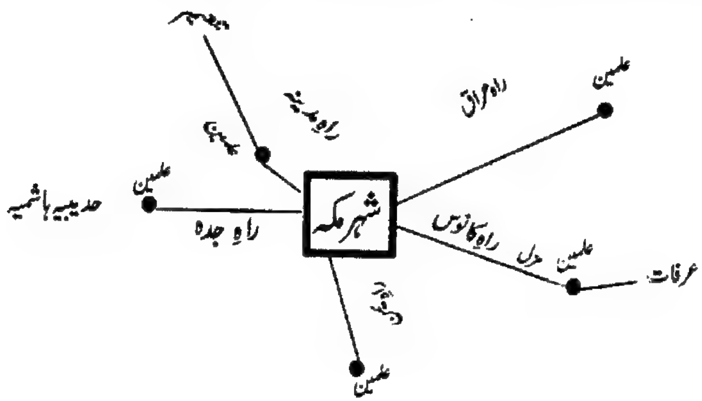
جاوی اور دوسرے حاجی ۵ر ذی الحجہ ہی سے منیٰ اور عرفات جانے شروع ہو گئے تھے۔ ۷ر ذی الحجہ کو شہر میں موٹریں چلانے کی بندش ہو گئی۔ اس لیے کہ اس روز حاجی بہ کثرت جانے لگے تھے اور اونٹ موٹروں سے بدکتے تھے۔ ہم نے اس روز منشی احسان اللہ خاں صاحب سے کھانے کی معافی مانگ لی۔ ۷ر کو سیٹھ عبدالشکور بھی آ گئے اور ہماری پارٹی میں شامل ہو گئے۔ ۸ر کی دوپہر کو ہم سب نے حج کا احرام باندھ لیا۔ دوپہر کا کھانا منشی صاحب کے ہاں کھایا اور عصر سے قبل منیٰ روانہ ہو گئے ۶ر ذی الحجہ کو ہم نے شیخ عبدالرحمٰن قصیبی سے بھی ملاقات کی اور بعض دوسرے احباب سے بھی ملے۔ غلاف کعبہ دیکھا جو دارالکسوہ میں تیار ہوا تھا۔ دارالکسوہ کے مدیر مہتمم خان محمد خاں صاحب ہیں اور غلافِ کعبہ بنانے والے اکثر کاری گر ہندوستانی ہیں۔ تمام کاری گروں کے سرکردہ چودھری اللہ بخش امرتسری ہیں۔ حج کے حالات بیان کرنے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں مکہ معظمہ، منیٰ، مزدلفہ، عرفات کے جغرافیائی حالات بیان کر دوں تاکہ قارئین کرام کو میرے بیانات سمجھنے میں زیادہ آسانی ہو۔ واللہ الہادی

(انقلاب: ۱۵ر جون ۱۹۳۰ء ص ۴، ۵)

باب چہارم

مکہ معظّمہ اور اس کے حوالی

حج کے حالات بیان کرنے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں مکہ معظمہ اور اس کے حوالی کے جغرافیائی حالات کا مختصر ذکر کردوں۔شہر مکہ معظمہ خشک پہاڑوں کے درمیان واقع ہے اور پہاڑیوں کے درمیان جس طرف نشیبی اور صاف جگہ ملتی گئی ہے، آبادی بڑھتی چلی گئی ہے۔مکانات پہاڑیوں پر بھی ہیں۔مثلاً جبل بوقبیس کا بیشتر حصہ مکانوں سے پٹا پڑا ہے۔ شعب علی، شعب بنی ہاشم اور شعب بنی عامر میں مکانات پہاڑیوں پر واقع ہیں۔ جیاد کی سمت بھی یہی حالت ہے۔جرول اور مسفلہ میں بھی۔شہر کے اردگرد دس دس بارہ بارہ میل کا علاقہ حدودِ حرم میں داخل ہے اور ہر سمت حدودِ حرم کے نشانات بنے ہوئے ہیں جنھیں ''علمین'' کہتے ہیں۔حدودِ حرم کی کیفیت مندرجۂ ذیل نقشے سے واضح ہوگی:



صرف تنعیم کی سمت میں حدودِ حرم قریب ہے یعنی شہر ساڑھے تین میل پر۔ عرفات کی سمت حدِ حرم تقریباً دس میل پر ہے۔ عراق و یمن جدہ کی سمت میں بھی تقریباً اتنا ہی فاصلہ ہے۔

تنعیم

تنعیم وہ مقام ہے جہاں سے حضرت عائشہؓ نے عمرہ کا احرام باندھا تھا۔ اب تک یہ مقام حدِ حرم کے پاس ہی ایک چھوٹی سی دیوار سے محصور ہے۔ جہاں حضرت عائشہؓ نے ''احرام کا دوگانہ'' ادا کیا تھا۔ اس محصور مقام کے ساتھ ایک حوض ہے۔ حوض کے مقابل کے کنارے پر ایک چھوٹی سی مسجد ہے جس کا نصف حصہ مسقف ہے۔ پاس چند ٹوٹے پھوٹے مکان ہیں۔ جو لوگ اُونٹوں پر مدینہ جاتے تھے تو اسی راستے سے جاتے تھے۔ موٹریں مکہ معظمہ سے مدینہ جاتی ہوئی پہلے جدہ جاتی ہیں، وہاں سے رابغ اور رابغ سے پُرانے سلطانی راستے سے مدینہ منورہ!

حدیبیہ

حدیبیہ تاریخ اسلام کا نہایت مشہور مقام ہے۔ ۶ھ میں حضور خواجہ دو جہاں (ﷺ) چودہ سو فدائیوں کے ساتھ عمرہ ادا کرنے کے لیے تشریف لائے تھے اور کفار نے حضور ﷺ کو عمرہ سے روکنے کی کوشش کی تھی حضورؐ حدیبیہ میں قیام فرما ہو گئے تھے جو حدِ حرم کے بالکل قریب ہے۔ یہیں سے حضرت عثمانؓ کو کفار کے ساتھ مصالحت کی بات چیت کے لیے بھیجا تھا لیکن جب افواہ اُڑی کہ کفار نے حضرت عثمانؓ کو شہید کر ڈالا ہے تو حضورؐ نے حدیبیہ ہی میں ایک درخت کے نیچے چودہ سو فدائیوں سے بیعت لی۔ لَقَدْ رَضِیَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ یُبَایِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ افواہ غلط تھی۔ یہیں وہ صلح نامہ لکھا گیا تھا جس کی نسبت ابتدا میں حضرت عمرؓ کا خیال تھا کی اس میں مسلمانوں کی پوزیشن کمزور ہوگئی ہے۔ حال آں کہ ایزد برتر و توانا کے نزدیک یہ صلح نامہ ''فتح مبین'' کا پیش خیمہ تھا۔ یہی وہ صلح نامہ تھا جس میں حضرت علیؓ نے حضورؐ کے نام کے ساتھ رسول اللہ لکھ دیا تھا۔ کفار نے اعتراض کیا اور حضورؐ نے جملہ رسول اللہ کے مٹا دینے کا حکم دیا تو

حضرت علیؓ نے عجز کے ساتھ عرض کیا "میرے لیے یہ مشکل ہے"۔ اس پر حضورؐ نے خود کاغذ دست مبارک میں لے کر رسول اللہ کا جملہ مٹا دیا تھا۔ جس درخت کے نیچے بیعت لی گئی تھی، حضرت عمرؓ کے زمانے تک وہ باقی تھا لیکن چونکہ لوگوں نے اسے زیارت گاہ عام بنا لیا اس لیے حضرت عمرؓ نے اسے کٹوا دیا تھا۔

جَبلِ ثور:

ہر راستے کے ساتھ دُور تک پہاڑوں کا سلسلہ چلا گیا ہے۔ تمام راستے وادیوں میں ہیں۔ بعض دو پہاڑیوں کے درمیان نشیبی جگہوں میں سے۔ پہاڑ تمام کے تمام جُھلسے ہوئے اور خشک ہیں۔ بعض کا رنگ بالکل سیاہ ہے بعض کا بھورا، بعض کا خاکی مائل جس میں سرخی کی جھلک نظر آتی ہے۔ یمن کے راستے پر شہر مکہ سے تقریباً چار میل دور جبل ثور ہے۔ حضور انورؐ نے ہجرت فرمائی تھی تو پہلے اس پہاڑ پر ایک غار میں پناہ لی تھی۔ حضرت اسما بنت ابی بکرؓ نے یہاں حضورؐ کو اور اپنے والدِ ماجد کو کھانا پہنچایا تھا۔ حضرت صدیق اکبرؓ کے سوا اس مقام کی معیت سے اور کوئی مشرف نہ ہوا۔ إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا

جبلِ نور اور غارِ حرا:

منیٰ کی طرف راستے سے ذرہ ہٹ کر جبلِ نور ہے۔ یہ ایک چھوٹی سی پہاڑی ہے جو اپنی بُرج نما بلندی کی وجہ سے گردو پیش کی تمام پہاڑیوں سے بے حد ممتاز ہے اور منیٰ کو جاتے ہوئے دور سے نظر آتی ہے۔ اسی پہاڑی پر غارِ حرا ہے جہاں حضورؐ قبل نبوت عبادت کے لیے تشریف لے جاتے تھے اور کئی کئی روز وہیں گزارتے تھے، یہیں سب سے پہلے جبرائیل امین علیہ السلام حضورؐ کے سامنے نمودار ہوئے تھے اور اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ کا الٰہی پیغام لائے تھے

میں ۱۹۲۵ء میں حجاز آیا تھا تو اس پہاڑی پر چڑھا تھا۔ صرف اوپر تک پہنچنے میں ۳۵ منٹ صَرف ہوئے تھے۔ نیچے اترنے میں بڑی تکلیف ہوئی تھی اور میں آٹھ دس جگہ بیٹھ کر اور دم لے کر اُتر سکا تھا۔ میں نے وہ غار بھی دیکھا تھا جس کے اندر بیٹھ کر حضور خواجہ دو جہاںؐ عبادت کیا کرتے تھے۔ مجھے اس وقت بڑا تعجب ہوا تھا کہ حضورؐ نے عبادت کے

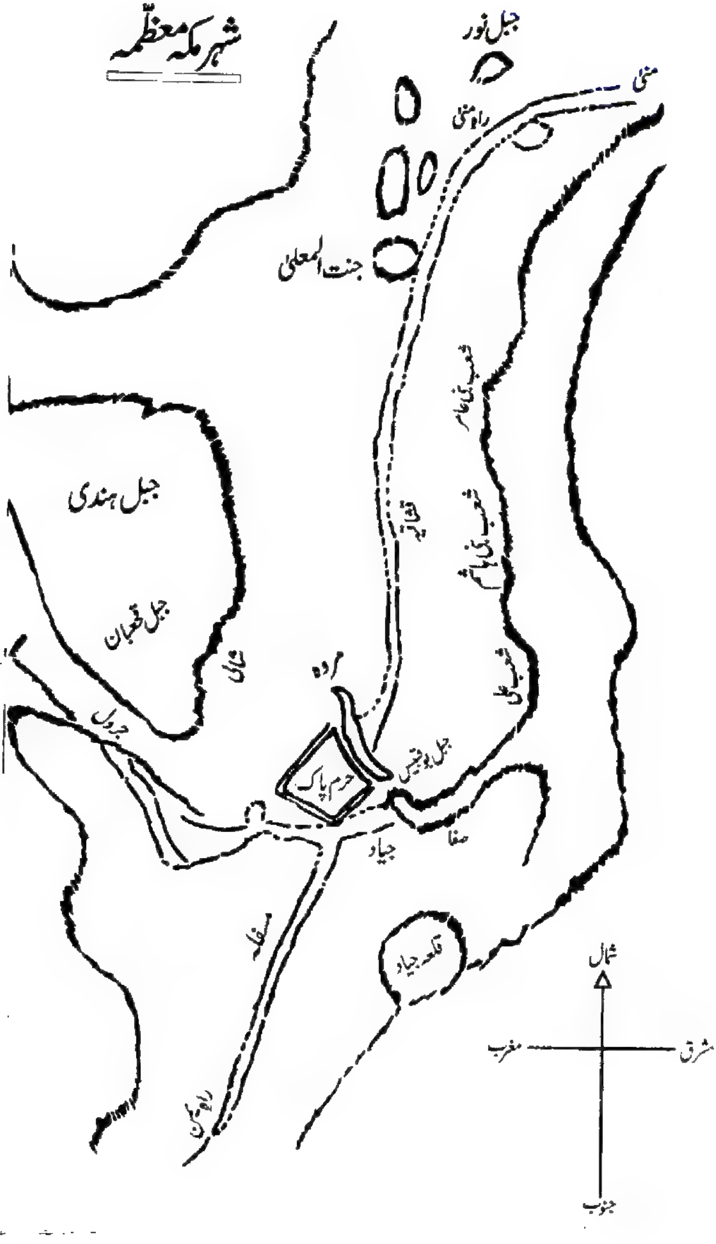
لیے اس پہاڑی کو کیوں کر منتخب فرمایا؟ آیا گردو پیش کی تمام پہاڑیوں پر چڑھ چڑھ کر دیکھا اور اس طرح یہ جگہ پسند خاطر پُر نور ہوئی؟ اس وقت میری رائے یہ بھی تھی کہ جبل نور اپنی مسافت اور بلندی کی وجہ سے چوں کہ تمام دوسری پہاڑیوں سے ممتاز ہے اس لیے حضور ﷺ نے اسے منتخب فرمایا۔ اس مرتبہ میں ایک روز حضرت مولانا عبید اللہ اور بمبئی کے ایک دوست کی معیت میں بوقبیس پر گیا تو دفعتاً میری نظر جبل نور پر جا پڑی۔ میں نے دو تین مرتبہ حضرت مولانا عبید اللہ سے عرض کیا کہ جبل بوقبیس پر کھڑے ہو کر گردو پیش پر نظر ڈالی جائے تو جبل نور جس قدر نمایاں اور نظر میں کھبتی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور کوئی چیز معلوم نہیں ہوتی۔ اس کے ساتھ ہی مجھے یقین ہو گیا کہ حضور خواجۂ دو جہاں ﷺ نے کیوں کر روزِ اول ہی عبادت کے لیے اس پہاڑی کو منتخب فرمالیا ہوگا۔ یہ پہاڑی سارے منظر پر حاوی نظر آتی ہے۔ حضرت مولانا نے فرمایا کہ تم تو یہی کہتے ہو لیکن میں کہتا ہوں کہ ابتدائی زمانے میں یہ جبل بوقبیس ہی سے نہیں بلکہ مَروہ سے بھی نظر آتی ہوگی۔ اور اس کے ساتھ یقیناً بہت سی خاص چیزیں وابستہ ہیں جو کسی دوسری پہاڑی کے ساتھ وابستہ نہیں!

شہر کی آبادی:

شہر مکہ کی آبادی کا صحیح تخمینہ پیش کرنا مشکل ہے، لیکن عام اندازہ یہ ہے کہ آبادی دو لاکھ سے کم نہ ہوگی۔ آبادی میں تقریباً ہر قوم کے لوگ شامل ہیں۔ ترک، تاتاری، ہندوستانی، افغان ،چینی ،جاوی،سوڈانی ،مراکشی ،مصری، بربری،یمنی ،شامی وغیرہ سب نظر آئیں گے۔ جرول کے حصے میں زیادہ تر تکرونی ،سوڈانی آباد ہیں۔ باقی حصوں کی آبادیاں مخلوط ہیں۔ جیاد ترکوں کے زمانے میں سِول لائن کی حیثیت رکھتا تھا۔ جرول کے باہر ترکوں کے زمانے کی ایک بارک ہے جبل ہندی پر ایک قلعہ ہے۔ جیاد کے عقب میں جو پہاڑی ہے،اس پر ایک قلعہ ہے یہ سب اِس وقت بُری حالت میں ہیں اور کوئی انھیں استعمال نہیں کرتا۔

حمیدیہ اور تکیۂ مصریہ:

حرم پاک کے مغرب میں بابِ جیاد اور باب ام ہانی کے سامنے دو قابلِ ذکر عمارتیں


شہر مکہ معظّمہ
جبل نور
منیٰ
راہِ منیٰ
جنت المعلیٰ
شعب بنی عامر
شعب بنی ہاشم
جبل ہندی
جبل قعیقعان
مروہ
شعب علی
جرول
حرم پاک
جبل ابو قبیس
صفا
جیاد
مسفلہ
قلعہ جیاد
راہِ یمن
شمال
مشرق
مغرب
جنوب

ہیں۔ اوّل حمیدیہ جو سلطان عبدالحمید خان کے عہد میں بنی تھی اور اس وقت سے لے کر اب تک حکومت حجاز کا مرکزی ادارہ چلی آتی ہے۔ اس کے برابر تکیہ مصریہ ہے جسے محمد علی پاشا وزیر مصر نے ۱۸۲۲ء میں تعمیر کرایا تھا۔ اس تکیے میں اب تک حکومت کی طرف سے مساکین کو روٹی تقسیم ہوتی ہے۔ عام طریقہ یہ ہے کہ مساکین اپنا نام لکھا کر ٹکٹ حاصل کر لیتے ہیں اور صبح و شام تین تین روٹیاں اور پکے ہوئے چاول لے جاتے ہیں۔ ایک روز ہم تکیے کو دیکھنے کے لیے گئے۔ محمد علی فواد مہتمم تکیہ نے ہمیں تکیے کے اندر کی بہت سی چیزیں دکھائیں۔ معلوم ہوا کہ حج کے ایام میں کم و بیش ڈھائی ہزار افراد اور عام حالت میں ڈیڑھ ہزار افراد روزانہ اس تکیے سے کھانا لیتے ہیں اس کے ساتھ شفا خانہ بھی ہے لیکن ہمیں اس کے دیکھنے کی فرصت نہ مل سکی۔ محمد علی فواد بڑے سرگرم اور خوش اخلاق انسان ہیں۔ وہ پہلے مدینہ منورہ کے تکیۂ مصری کے مہتمم تھے، اب مکہ معظمہ کے تکیے کے مہتمم ہیں۔ تمام مساکین کھانا لینے کے لیے آتے ہیں تو قوم وار اور الگ الگ بیٹھ جاتے ہیں۔ مثلاً ہندوستانی ایک جگہ، تکرونی ایک جگہ، مغربی ایک جگہ وقس علی ہذا۔ پھر ان میں بھی مستورات الگ رہتی ہیں اور مرد الگ۔ دس دس پندرہ پندرہ کی جماعت اٹھتی ہے اور سب اپنے اپنے ٹکٹ دکھا دکھا کر روٹی لیتے جاتے ہیں۔ محمد علی فواد خود روٹیوں کا ایک ٹوکرا لے کر باہر کی ڈیوڑھی میں بیٹھ جاتے ہیں اور جس شخص کو زیادہ مسکین اور مصیبت زدہ پاتے ہیں، ایک ایک دو دو روٹیاں زائد دے دیتے ہیں۔

شفا خانہ، دارالکسوہ اور دارالموتمر:

محلّہ جیاد کی عمارتوں میں ایک بجلی گھر ہے جس کے مہتمم اسماعیل ذبیح ہیں۔ ایک شفا خانہ ہے جس کا بیشتر حصہ حال ہی میں بنا ہے۔ باقی عمارت زیرِ تعمیر ہے۔ شفا خانے کو بھی میں نے اندر سے دیکھا، بہت خوب صورت اور دل کشا عمارت ہے۔ دارالکسوہ بھی جیاد ہی میں ہے، جہاں کعبہ کا غلاف، خدام بابِ کعبہ کا برقعہ اور مقام ابراہیم کا غلاف بنتا ہے اس کے مہتمم خان محمد خان صاحب ہیں اور بیشتر کاری گر ہندوستانی ہیں۔ دارالکسوہ کی عمارت ایک منزل کی ہے۔ سنا جاتا ہے کہ دوسری منزل بننے والی ہے اس کے قریب یہ دارالموتمر ہے جہاں ۱۹۲۶ء

میں موتمر اسلامی کا اجلاس ہوا تھا۔ اب اس عمارت میں حکومت حجاز کا دفتر مال ہے۔ اس کے رئیس اعلیٰ شیخ عبداللہ سلیمان ہیں۔ ایک مالیہ عام، دوم مالیہ بدو۔ دونوں دفتروں کا انتظام شیخ عبداللہ سلیمان کے ہاتھ میں ہے۔ اس کے پاس ہی معہد سعودی ہے جسے مکہ معظمہ کی یونیورسٹی سمجھنا چاہیے۔ اس معہد کے پرنسپل ایک مصری نوجوان ہیں، جو کئی مرتبہ ہم سے ملے۔

رباط بواہیر:

جیاد میں ایک اور عمارت خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ اس پر ہندوستانی مسلمان جتنا بھی فخر کریں، بجا ہوگا یعنی بوہروں کی رباط یا محل سیفیہ۔ یہ نہایت عالی شان عمارت ہے۔ اس کے تین درجے ہیں۔ بوہروں کی جماعت نے پچاسی ہزار میں اس کی زمین خریدی تھی اور ملا طاہر سیف الدین صاحب امام جماعت بواہر نے پانچ لاکھ روپیہ اپنی گرہ سے صرف کر کے یہ عمارت بنوائی۔ بلاشائبہ مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ پبلک عمارتوں میں ایسی شان دار، کشادہ، خوش وضع اور مضبوط عمارت مکہ بھر میں ملنی محال ہے۔ اس رباط میں کم وبیش سات سو آدمی رہ سکتے ہیں۔ طریقہ یہ ہے کہ بوہروں کی جماعت کا جو شخص حج کے لیے جانا چاہتا ہے وہ پہلے اطلاع دے دیتا ہے اور اس کے لیے جگہ کا انتظام ہو جاتا ہے۔ اس کے رباط میں پہنچنے پر تین وقت کا کھانا رباط کی طرف سے دیا جاتا ہے۔ عرفات کو جاتے وقت بھی پورے کھانے کا انتظام رباط کی طرف سے ہوتا ہے۔ کاش اس قسم کی ایک کشادہ رباط عام ہندوستانیوں کے لیے بن جائے جس میں بواہر یا کسی دوسرے سرگروہ کی تخصیص نہ ہو۔ بلکہ سب ہندوستانی مسلمان اس میں ٹھہریں لیکن ایسی عمارت اسی حالت میں مسلمانوں کے لیے مفید ہوسکتی ہے کہ اس میں کم وبیش بیس ہزار مسلمانوں کے ٹھہرنے کی گنجائش ہو۔ اگر ہندوستان کے مسلمان اس کام کے لیے تیار ہو جائیں تو امید واثق ہے کہ حکومت حجاز ایک کشادہ جگہ کا بندوبست کر دے گی۔ ہم سب نے اسماعیل سے کہا کہ وہ اس کام کا بیڑہ اُٹھائے اور کم از کم اس کا آغاز کر دے۔ اتمام وتکمیل کا خودبخود بندوبست ہو جائے گا۔ اس وقت مکہ میں ہندوستان کی بہت سی رباطیں ہیں مثلاً سرکار نظام کی رباطیں، سرکار بھوپال کی، سرکار بہاول پور کی رباطیں، چھتاری کی رباط وغیرہ اور ان کے لیے مہتمم مقرر ہیں۔ لیکن کاش اس قسم کی

تمام رباطیں ایک جگہ اور ایک مقام پر آجائیں۔ اعلیٰ حضرت حضور نظام، اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال، اعلیٰ حضرت نواب صاحب بہاول پور اگر اس طرف توجہ مبذول فرمائیں تو ہندوستان کے مسلمان اپنے ان محبوب فرماں رواؤں کے نقش قدم پر چل کر بہت جلد اعلیٰ درجے کی ہندی رباط یا حقیقۃً ہندی محلے کا انتظام کر دیں۔

شاہی محل:

حرم پاک سے جنت المعلی کی طرف جائیں تو راستے میں بڑی عالی شان عمارتیں ملتی ہیں ان میں سے ایک عمارت اس وقت امیر فیصل گورنر حجاز کی قیام گاہ ہے۔ آگے بڑھیں تو ایک محل بائیں ہاتھ ملتا ہے۔ پہلے سلطان المعظم اس میں رہتے تھے آج کل سلطان کے بھائی امیر محمد رہتے ہیں۔ جنت المعلی سے آگے بڑھ کر منیٰ کو جائیں تو آبادی کے اختتام پر نیا شاہی محل نظر آتا ہے۔ اس کا تقریباً نصف حصہ مکمل ہو چکا ہے باقی نصف اس وقت تک زیر تعمیر ہے یہ نہایت عالی شان عمارت ہے اور ساری سیمنٹ سے بنائی جارہی ہے۔ اس کے قریب ہی ایک مقام ہے جس میں بجلی کی مشین ہے یہ مشین صرف شاہی محل کی روشنی کے لیے ہے۔ منیٰ کی طرف بلند پہاڑ کی چوٹی پر ایک مختصر سی عمارت ہے جسے شاہی محل کی چوکی لکھنا چاہیے۔ جرول کی طرف آئیں تو آبادی کے تقریباً اختتام پر بائیں ہاتھ ایک باغ ملتا ہے، جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ یہ بلدیہ مکہ کا باغ ہے۔ ہم نے اسے دیکھا تو یہ بالکل اُجڑا ہو اتھا۔ کہتے ہیں کہ اب اس میں نئے سرے سے پودے لگانے کی تجویزیں ہو رہی ہیں۔ اس سے آگے بڑھیں تو دائیں ہاتھ شریف عون کا باغ ملتا ہے۔ یہ بڑا وسیع باغ ہے لیکن اب زیادہ اچھی حالت میں نہیں۔ اس باغ کے بالکل سامنے شیخ عبداللہ سلیمان کا مکان ہے

شہدا و تنعیم:

جرول سے آگے بڑھ کر مدینہ کے راستے پر آجائیں تو آبادی سے تقریباً ڈیڑھ میل کے فاصلے پر کھلا میدان ہے جس میں چند متفرق عمارتیں اور چند متفرق کھنڈر نظر آتے ہیں اس مقام کا نام ''شہدا'' ہے۔ کہتے ہیں کہ یہاں بنو اُمیہ اور بنو ہاشم کی آخری جنگ ہوئی تھی۔ یہاں بہت سے آدمی مارے گئے تھے۔ یہ مقام مکہ والوں کی عام سیر گاہ ہے۔ شام کے

وقت اکثر کئی گدھوں پر یا گدھوں اور خچروں کی گاڑیوں پر سوار ہو کر یہاں آجاتے ہیں اور ایک دو گھنٹہ کھلی ہوا میں گزار کر عشاء کے وقت واپس چلے جاتے ہیں۔ بعض لوگ رات کو بھی یہیں رہتے ہیں۔ یہاں قہوہ خانے بھی بنے ہوئے ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمیرؓ کی قبر بھی یہیں تھی۔ ''شہدا'' میں سلطان کے لیے بھی ایک مختصر سی عمارت بن گئی ہے، جس کے ساتھ وسیع باغ لگایا جا رہا ہے۔ اس مقام سے ڈیڑھ دو میل آگے نکل کر تنعیم آجاتا ہے، جو مدینہ کے راستے پر حدِ حرم کے ساتھ واقع ہے۔ تنعیم میں مستقلاً کوئی آبادی نہیں، البتہ حج کے دنوں میں چار پانچ قہوہ خانے کھل جاتے ہیں۔ اس لیے کہ عمرہ کرنے والے حاجی عموماً اس مقام پر آکر عمرے کا احرام باندھتے ہیں۔

مکہ معظمہ کے مکانات:

مسفلہ کی طرف جائیں تو آبادی کے تقریباً اختتام پر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا مکان ملتا ہے آبادی سے تین چار میل باہر نکل جائیں تو جبل ثور نظر آتا ہے جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کے لیے نکلتے وقت پناہ گزیں ہوئے تھے۔ مکہ معظمہ کے اکثر مکانات دو منزل سے لے کر پانچ منزل تک کے ہیں چونکہ پتھر ہر جگہ عام ہیں اس لیے تقریباً سارے مکانات پتھر کے بنے ہوئے ہیں۔ بعض مکانوں کے بالائی حصوں میں چھوٹی اینٹیں بھی دیکھیں جیسی کہ پنجاب کے پرانے مکانوں میں لگی ہوئی نظر آتی ہیں۔ لکڑی اگرچہ حجاز میں بہت کم یاب ہے لیکن اہل مکہ اپنے مکانوں کو ہوادار بنانے کے لیے لکڑی بکثرت استعمال کرتے ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ساری لکڑی جاوہ سے آتی ہے۔ حرمِ پاک کے اردگرد ہر حصے میں وضو کے لیے خاص مقامات بنے ہوئے ہیں۔ حج کے دنوں میں اردگرد کے اکثر دکان دار بھی وضو کا سامان رکھ لیتے ہیں۔

قدیم تاریخی مقامات:

مکہ معظمہ کے قدیم تاریخی مقامات کے متعلق اس وقت تک یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ اس لیے کہ اکثر مقامات میں اکثر و بیشتر ردو بدل ہوتا رہتا ہے، لیکن کہا جاتا ہے کہ دارِ ارقم (جہاں حضرت عمرؓ مسلمان ہوئے تھے اور جو ابتدائے اسلام میں مسلمانوں کا

دارالشوریٰ تھا) دارِ خدیجۃ الکبریٰ (مولدِ فاطمہ) دارِ علی، مولدِ خواجہ دو جہاں ﷺ وغیرہ قشاشیہ اور شعب بنی عامر میں تھے۔ شیبی کا ایک بہت بڑا مکان حرم کے بابِ علی کے قریب مسعیٰ پر واقع ہے۔ دوسرا مکان جبل بوقبیس پر ہے۔ شیبی کے مسعیٰ والے مکان کے ساتھ ہی حکومت حجاز کا خزانہ ہے اور اس سے بالکل ملحق مدرسہ ہے۔

صفا و مَروہ:

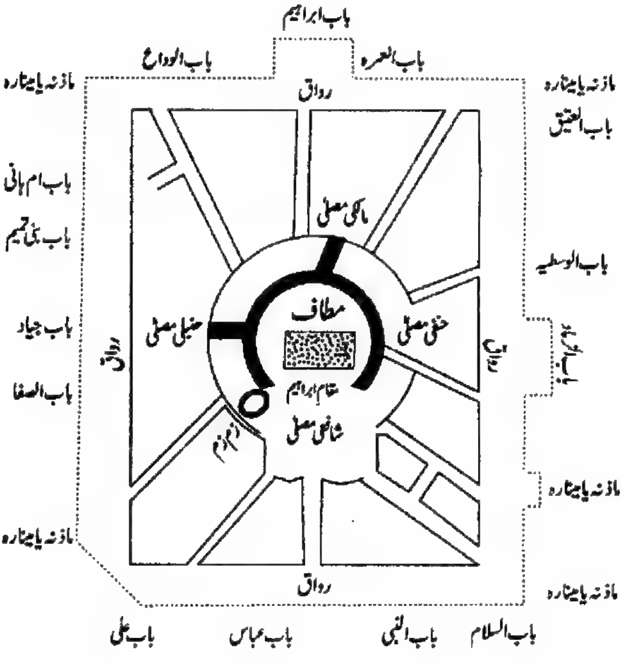
صفا سے مَروہ تک کا فاصلہ کسی حالت میں بھی ایک فرلانگ سے کم نہ ہوگا۔ میں جب پہلے مکہ معظمہ آیا تھا تو مسعیٰ میں فرش وغیرہ کا کوئی انتظام نہ تھا۔ اب سلطان نے سارے مسعیٰ میں پختہ فرش کا انتظام کر دیا ہے۔ اس وقت مسعیٰ مکہ کا سب سے بڑا بازار ہے۔ اس کے بیشتر حصے میں دونوں طرف دکانیں لگی ہوئی ہیں۔ شریف حسین نے اس پر چھت ڈلوادی تھی جو بالکل بوسیدہ اور رڈی تھی۔ سلطان اب اس چھت کو بدلوا رہے ہیں۔

حدُودِ حرم کا راز:

حضرت مولانا عبید اللہ سے ہم نے حدودِ حرم کا راز پوچھا تو فرمانے لگے کہ حدود کے اندر کی ساری زمین حقیقۃً وقف کے طور پر رکھی گئی تھی۔ غرض یہ تھی کہ حرم کی زمین کا کوئی ٹکڑا کسی شخص یا جماعت یا قوم یا حکومت کی ملکیت نہ ہو بلکہ ہر مسلمان اس میں مقیم ہو سکے لیکن صدیوں سے یہ حقیقت گم ہو چکی ہے۔ اکثر اربابِ خیر نے مکہ معظمہ میں عمارتیں خرید خرید کر حرم کی نذر کر دی تھیں۔ مکہ مکرمہ والے اہتمام کے پردے میں ان پر قابض ہو چکے ہیں اور انھوں نے نہ محض حرم کی زمین ہی کو ذاتی ملکیت بنایا بلکہ باقاعدہ وقف کردہ زمینوں پر بھی قبضہ جما بیٹھے۔ کاش موجودہ حکومت پرانے کاغذات نکلوا کر دیکھے، تحقیق کرے اور حرم کی موقوفہ زمینوں کو ازسرِ نو ظالم قابضوں کے قبضے سے باہر نکالے۔ اس سلسلے میں یہ بھی ضروری ہے کہ مسجد کو چاروں طرف سے وسیع کیا جائے۔ نیز یہ بھی ضروری ہے کی مسعیٰ کا بازار اُٹھوادیا جائے اور اسے مسجد مبارک کا جزو بنا دیا جائے۔ اس لیے کہ اگرچہ یہ مسجد اب بھی انتہائی فراخ مساجد سے بڑی ہے۔ لیکن حالت یہ ہے کہ ڈیڑھ لاکھ سے زائد آدمی اس میں بیک وقت نماز نہیں پڑھ سکتے، حال آں کہ حج کے دنوں میں اکثر و بیشتر پانچ لاکھ کا اجتماع ہوتا ہے۔

حرم پاک:

حرم پاک کے متعلق زیادہ تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ مسجد مبارک کی عمارت تقریباً مستطیل ہے۔ باہر چاروں سمتوں میں رواق یا برآمدے بنے ہوئے ہیں۔ وسط میں سارا صحن غیر مسقف ہے۔ رواقوں کے ستون اعلیٰ درجے کے پتھر کے ہیں لیکن فرش اچھا نہیں ہے اکثر و بیشتر اَن گھڑ سیاہ یا نیلے پتھر لگے ہوئے ہیں۔ جو محض سجدوں کی کثرت سے قدرے صاف ہو گئے ہیں یا یوں کہنا چاہیے کہ ان کے کھردرے پن میں کمی آگئی ہے، رواقوں کے مختلف حصوں سے مطاف تک جانے کے لیے اس نیلے یا سیاہ اَن گھڑ پتھر کے چھوٹے چھوٹے راستے بنے ہوئے ہیں۔ جو گرمی کے موسم میں اس قدر تپ جاتے ہیں کہ ان پر چلنا غیر ممکن ہو جاتا ہے۔ رنگون کے ایک مخیّر آدمی نے ان راستوں کے لیے ٹاٹ بنوا کر بھیج دیے۔ رواقوں سے لے کر مطاف تک باقی سارا صحن چھوٹے چھوٹے سنگریزوں سے بھرا ہوا ہے جو چلتے وقت چبھتے ہیں۔ مطاف کے عین درمیان میں بیت اللہ ہے۔



جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بنیادوں کے مطابق مستطیل تھا مگر حضور خواجہ دو جہاں ﷺ کے عہد مبارک میں (بعثت سے قبل) قریش نے اسے بناتے وقت کچھ حصہ چھوڑ دیا تھا۔ اس لیے اب یہ تقریباً مربع ہو گیا ہے۔ چھوڑے ہوئے حصے کو حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے بیت اللہ میں ملا دیا تھا مگر جب بنو امیہ کو مکہ معظمہ پر دوبارہ تسلط حاصل ہو گیا اور حضرت ابن زبیرؓ شہید ہو گئے تو بنو امیہ نے اتنے حصے کو توڑ کر پھر بیت اللہ سے نکال دیا۔ اس حصے کو حطیم کہتے ہیں۔ سلطان عبدالحمید خان کے زمانے میں حطیم کی دیوار اور فرش سنگِ مرمر کے بن گئے۔ طائفین اب طواف کرتے وقت حطیم کو شامل بیت اللہ سمجھ کر طواف کرتے ہیں۔ ❶

(انقلاب: ۲۲ر جون ۱۹۳۰ء ص ۴، ۵)

مطاف اور مصلے:

بیت اللہ کے ارد گرد کا گول دائرہ مطاف کہلاتا ہے۔ حضرت خواجہ دو جہاں ﷺ کے زمانے میں مسجد الحرام صرف اتنی تھی۔ مطاف کا فرش سفید پتھر کا ہے۔ بعض پتھر پیلے رنگ کے یا گندمی رنگ کے ہیں لیکن ان میں کوئی خاص ترتیب ملحوظ نہیں رکھی گئی۔ بعض سلیں بہت لمبی اور بعض بہت چھوٹی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مطاف کا فرش بھی طائفین کے پاؤں ہی سے صاف ہوا ہے۔ مطاف کے ارد گرد نقشے میں ایک گول دائرہ نظر آئے گا۔ یہ مطاف سے تقریباً ایک فٹ اونچا فرش ہے اور اس پتھر کا ہے جیسا کہ رواقوں کے فرش میں لگا ہوا ہے۔ اسی حصے میں بیت اللہ کی چاروں سمتوں میں چار مصلے ہیں۔ مقام ابراہیم پر شافعی مصلی ہے اس کے دائیں جانب حنفی مصلی ہے جو دو منزلہ ہے اس سے قبل اس مقام پر دارالندوہ تھا جس میں کفار نے حضور خواجہ دو جہاں ﷺ کو قتل کرنے کا ساز باز کیا تھا۔ مقام ابراہیم کے مقابل کی سمت میں مالکی مصلی ہے اور حنفی مصلی کے مقابل کی سمت میں حنبلی مصلی ہے۔ مالکی اور حنبلی مصلے محض چھوٹے چھوٹے سائبان سے ہیں۔ مقام ابراہیم کے دائیں جانب منبر ہے جو بہت عالی

❶ اب مسجد حرام کے بیرونی حصوں سے لے کر مطاف تک فرش میں نہایت عمدہ' چکنا اور حدت نہ قبول کرنے والا پتھر استعمال ہوا ہے۔ اب کسی حاجی یا نمازی کو چلنے پھرنے میں' طواف میں' سجدہ کرنے میں کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ نہ پتھر چبھتے ہیں نہ پیر جلتے ہیں۔ والحمدللہ علی ذلک!

شان ہے اور اس کے بائیں چاہ زم زم ہے جس پر دو منزلہ عمارت بنی ہوئی ہے۔ مطاف کے باہر گول دائرے میں لکڑی کے متعدد کھمبے کھڑے ہیں اور ان کھمبوں کے ساتھ بجلی کے قمقمے لگے ہوئے ہیں نیز عمدہ اور خوب صورت بلوری ہنڈے بھی ہیں۔ ①

بیت اللہ کے ارکان:

بیت اللہ کا جو کونہ مقام ابراہیم کے دائیں جانب ہے اور چاہ زم زم کے سامنے ہے اس میں حجر اسود نصب ہے۔ یہیں سے طائفین طواف شروع کرتے ہیں۔ اس گوشے کو رکن حجر اسود کہتے ہیں۔ اس سے چار پانچ قدم کے فاصلے پر باب کعبہ ہے باب کعبہ اور رکن حجر اسود کے درمیان کا حصہ ملتزم کہلاتا ہے بائیں سے دائیں جانب کا گوشہ رکن عراقی کہلاتا ہے۔ اس کے بعد حطیم کی دیوار آجاتی ہے۔ حطیم کا چکر کاٹنے کے بعد جو گوشہ آتا ہے وہ رکن شامی ہے اور اس کے آگے رکن یمانی۔ حجر اسود کو طواف کرتے وقت بوسہ دینا سنت ہے اگر ہجوم زیادہ ہو تو دور کھڑے ہو کر اشارے کے ساتھ بوسہ دے لینا کافی ہے۔ اسی طرح رکن یمانی کو ہاتھ لگانا سنت ہے، اگر ہاتھ نہ لگایا جاسکے تو دور سے اشارہ کر دینا کافی ہے۔ ان دو رکنوں کو دوسرے ارکان پر خاص فضیلت دینے کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ حقیقۃً یہی دو رکن ابراہیمی پر واقع ہیں۔ ان کے مقابل کے رکنوں میں بناء ابراہیمی قائم نہیں رہی۔

کعبہ کی عمارت:

مقام ابراہیم کی نسبت یقینی طور پر کچھ بیان کرنا مشکل ہے۔ مختلف روایات ہیں۔ اول یہ کہ اس کے اندر وہ پتھر ہے جس پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم نے بیت اللہ کو تعمیر کیا تھا۔ یہ پتھر باب کعبہ کے دائیں جانب دیوار کے ساتھ تھا۔ بعد میں اُسے اٹھوا کر مطاف کے باہر ڈلوا دیا گیا۔ دوسری روایت یہ ہے کی کعبہ کی تعمیر کو پایہ تکمیل کو پہنچا کر حضرت ابراہیم نے اس جگہ نماز پڑھی تھی۔ بیت اللہ کے اندر کی سطح زمین سے تقریباً قد آدم اونچی ہے۔ معلوم ہوتا ہے

① اب تین مصلے اٹھا دیے گئے' صرف ایک مصلی اور کسی سے نسبت کے بغیر ہے' حجر اسود' چاہ زم زم' مقام ابراہیم' حطیم وغیرہ تمام چیزیں اپنی اپنی جگہ میں بجلی کی روشنی میں پوری مسجد اور حرم پاک ہر وقت بقعۂ نور بنا رہتا ہے۔ مسجد کی جدید تعمیرات نے نقشہ ہی بدل دیا ہے۔ اب یہ باتیں حج کے سفرناموں ہی میں پڑھنے کو ملیں گی۔

کہ زمین سے لے کر آدمی کے قد کی اونچائی تک ایک پشتہ بنایا گیا اور اس پر بیت اللہ تعمیر ہوا ہے۔ چنانچہ دروازہ زمین سے قد آدم اونچا ہے اور سیڑھی لگا کر اندر داخل ہوتے ہیں۔

غلاف بیت:

کعبے کے اوپر سقف سے لے کر زمین تک سیاہ پردہ پڑا رہتا ہے، جس کے وسط میں اردگرد ایک مطلا ٹکڑا ہوتا ہے۔ اس پر زری سے خوش نما بیلیں بنی ہوئی ہیں۔ زری سے مختلف آیات لکھی جاتی ہیں۔ اسے حزام کہتے ہیں، حزام کی طرح کعبہ کا پردہ بھی غلاف سے الگ بنتا ہے اور اس پر زری کا نہایت عمدہ کام ہوتا ہے۔ غلاف تیار ہو کر ۹ر ذی الحجہ کو شیبی کے حوالے ہو جاتا ہے۔ شیبی ۸ر کو پرانا غلاف نیچے سے کاٹ کر سفید رنگ کا ایک کپڑا باندھ دیتا ہے۔ اسے احرام کعبہ کہتے ہیں۔ لیکن حقیقۃً اس ایجاد کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ شیبی کو حاجیوں کے ہاتھ غلاف کے ٹکڑے فروخت کرنے کا موقع مل جائے۔ ۹ر تاریخ کو تمام حاجی عرفات میں ہوتے ہیں اس وقت شیبی پرانا غلاف اُتار کر نیا غلاف چڑھا دیتا ہے۔ کعبہ کی دیواروں کا اندرونہ بھی غلاف سے ڈھپا رہتا ہے اور اندر کی طرف سے چھت بھی۔ ہم نے دیکھا تو معلوم ہوا کہ غلاف بہت پرانے ہیں۔ کعبہ کی چھت صندل کی لکڑی کے تین وزنی ستونوں پر کھڑی ہے یہ غالباً وہی ستون ہیں جو حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے کعبہ کی تعمیر کے وقت یمن سے منگائے تھے۔ رکن عراقی کے ساتھ اندر کی طرف کعبے کی چھت پر جانے کی سیڑھی ہے۔ حطیم کی طرف کعبہ کی میزاب ہے۔

زم زم اور سائبان:

چاہِ زم زم حقیقۃً عجائبات میں سے ہے۔ یہ کنواں کم وبیش پانچ ہزار برس سے جاری ہے۔ اس سے اس قدر پانی نکلتا ہے کہ شاید ہی کسی دوسرے سے نکلتا ہو۔ لیکن آج تک اس کے پانی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی اور جن ڈاکٹروں نے اس کے پانی کا کیمیاوی تجزیہ کرکے دیکھا ہے، وہ کہتے ہیں کہ طبی نقطہ نگاہ سے یہ پانی بے حد مفید ہے۔ ہم نے سیکڑوں آدمیوں سے سنا کہ وہ اسے شافی امراض بتاتے ہیں۔ کم از کم ایک واقعے کا تو خود ہمیں بھی علم ہے۔ ہمارے محترم رفیق حافظ محمد صدیق صاحب رئیس دہلی جدے سے مکہ مکرمہ گئے

تھے تو راستے میں ان کی طبیعت بے حد خراب ہو گئی تھی، لیکن حرم میں پہنچ کر انھوں نے زم زم پیا اور تھوڑا سا پانی سر پر ملا تو ان کا سر درد جاتا رہا۔ بیان کیا جاتا ہے۔ کہ اس کنوئیں میں مختلف سمتوں سے سوتے آتے ہیں اور پانی کا بڑا سوتا رکن حجر اسود کی طرف سے آتا ہے۔ سلطان ابن سعود کے عہد میں حرم کے اندر کوئی قابل ذکر تبدیلی نہیں ہوئی، صرف زم زم پر چند سبیلیں لگ گئی ہیں نیز رواقوں کے ساتھ چھوٹے چھوٹے سائبان لگا دیے گئے ہیں جن کی وجہ سے گرمی اور دھوپ کے اوقات میں نمازیوں کی مزید دو صفیں کھڑی ہونے کی گنجائش نکل آئی ہے، لیکن یہ سائبان بہت معمولی حیثیت رکھتے ہیں۔

طواف کی کیفیت:

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں طواف ہر وقت ہوتا رہتا ہے۔ دن یا رات کا کوئی وقت ایسا نہیں جس میں دس بیس یا سو دو سو طائفین مصروف طواف نہ ہوں۔ سخت سے سخت گرمی اور شدید سے شدید بارش میں بھی مطاف خالی نہیں ہوتا۔ مسجد میں زیادہ رونق صبح کی نماز اور پھر مغرب کی نماز میں ہوتی ہے۔ حج کے دنوں میں یا ایام تشریق سے تین چار روز بعد تک حرم میں مغرب کے وقت اس شخص کو کھڑے ہونے کی جگہ ملتی تھی جو نماز سے دس پندرہ منٹ پہلے آ جاتا تھا۔ ورنہ باہر سڑکوں پر کھڑے ہو کر نماز ادا کرنی پڑتی ہے لیکن جب اکثر حاجی چلے گئے اور باہر کے بہت کم لوگ باقی رہ گئے تو اُس وقت بھی مغرب کی نماز میں تیس ہزار سے لے کر پچاس ہزار تک نمازی ہوتے تھے۔ مطاف میں بھی زیادہ ہجوم صبح اور شام ہی کے اوقات میں ہوتا ہے، اکثر اہل مکہ مغرب سے آدھ گھنٹہ قبل حرم میں آجاتے ہیں۔ بعض بعد ادائے نماز طواف کر کے نماز عشا کا انتظار کرتے ہیں اور بعض نماز مغرب سے قبل طواف کر کے نماز ادا کرتے ہی چلے جاتے ہیں۔

اذان:

اذان چاہِ زم زم کے مکان کی چھت سے شروع ہوتی ہے اور حرم کے مؤذن اس کا اعادہ کرتے ہیں۔ اس وقت قلب پر عجیب کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ پہلے ہر نماز کے وقت چار جماعتیں ہوتی تھیں، اب صرف ایک جماعت ہوتی ہے۔ سلطان ابن سعود نے حجاز پر جو

احسان کیے ہیں اُن میں سے ایک بہت بڑا احسان یہ بھی ہے۔ پہلے اکثر و بیشتر دیکھا جاتا تھا کہ شافعی امام نماز پڑھا رہا ہے اور حنفی و مالکی و حنبلی بیٹھے ہیں، یا حنفی امام اُٹھتا ہے تو شافعی، مالکی اور حنبلی بیٹھے ہیں۔ اب باری باری مختلف امام نماز پڑھاتے ہیں اور سارے مسلمان خواہ وہ کسی فرقے سے تعلق رکھتے ہوں، ایک ساتھ نماز پڑھتے ہیں۔

مصری عورتیں نجدی اور جاوی:

طواف، سعی اور نماز کے اوقات میں بعض باتیں مجھے خاص طور پر تکلیف دہ نظر آئیں۔ اوّل یہ کہ بعض لوگ طواف میں بے حد دھکا پیل شروع کر دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ تکلیف دہ طائفین (یا حقیقۃً طائفات) مصری عورتیں ہیں۔ وہ اس بے پروائی سے دھکا دیتی ہیں کہ اچھے قوی اور توانا مرد کے حواس خطا ہو جاتے ہیں اور طواف میں متوجہ الی اللہ ہونے کا سارا لطف زائل ہو جاتا ہے۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ میں طواف کے بعد ملتزم سے ہوتا ہوا مقام ابراہیم کی طرف آ رہا تھا۔ طائفین کا ہجوم تھا۔ میں آہستہ آہستہ باہر نکلنے لگا کہ مستورات کا ایک گروہ آ گیا۔ میں اُن کے بچاؤ کے لیے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ گروہ گزر گیا میں نے دو قدم آگے بڑھائے تو پھر مستورات کا ایک گروہ آ گیا۔ میں دوبارہ اپنے ہاتھ پھیلا کر کھڑا ہو گیا۔ یہ گروہ بھی گزر گیا تو میں نے پھر آگے قدم بڑھایا۔ اب مصری عورتوں کا ایک گروہ آ گیا۔ میں نے تیسری مرتبہ اپنے ہاتھ پھیلائے تاکہ وہ عورتیں بھی آرام سے گزر جائیں۔ اس دوران میں سب سے آگے کی قوی الجثہ عورت نے میری گردن پر ہاتھ رکھ کر اس زور سے مجھے دھکا دیا یا حیدر آباد والوں کی اصطلاح کے مطابق ''گردنی'' دی کہ میں مقام ابراہیم کے پاس پہنچ گیا۔ آپ جانتے ہیں کہ میں بھی قوی اور تنومند ہوں دُبلا پتلا، منحنی اور کمزور آدمی نہیں ہوں لیکن عورتوں کے مقابلے میں مجھے اپنی کمزوری اور بے بسی کا ایسا تجربہ کبھی نہیں ہوا تھا، جیسا کہ یہاں ہوا۔ میں اپنا یہ مقام سمجھتا تھا کہ عورتوں کی حفاظت کروں۔ لیکن ظاہر یہ ہوا کہ جن عورتوں کی حفاظت کے لیے میں نے ہاتھ پھیلائے تھے اُن میں سے ایک نے آگے بڑھ کر میرا سارا تفاخرِ حفاظت خاک میں ملا دیا۔ اس کے بعد مجھے کبھی یہ جُرأت نہ ہوئی کہ اپنے آپ کو مصری عورتوں کی حفاظت کا اہل

سمجھوں۔ ملا۔ جہاں وہ نظر آتیں میں گردن نیچی کرکے اپنی حفاظت کے لیے فکر مند ہو جاتا۔ جس طرح کہ توی الجثہ مردوں کے ہجوم میں کمزور عورت اپنی حفاظت کے لیے متفکر ہوجایا کرتی ہے۔ مصری عورتوں سے دوسرے درجے پر نجدی ہیں، ان میں سے بعض طواف میں بڑی وحشت سے پیش آتے ہیں۔ تیسرا درجہ جاویوں کا ہے۔ جاوی عموماً چھوٹے قد کے ہوتے ہیں اور دیکھنے میں انسان کو ان پر رحم آجاتا ہے۔ لیکن طواف کے اوقات میں یہ لوگ بھی دھکا بازی سے باز نہیں رہتے۔

مطوفین کا شور وشغب:

طواف کے ضمن میں سخت تکلیف مطوفین سے ہوتی ہے۔ یہ لوگ پیسے لے کر لوگوں کو طواف کراتے ہیں یعنی خود دعاؤں کے ایک ایک دو دو لفظ آواز سے پڑھتے جاتے ہیں اور حاجی ان الفاظ کا اعادہ کرتے جاتے ہیں۔ مطوفین کا اولین مقصد چوں کہ پیسہ کمانا ہوتا ہے۔ اس لیے اکثر وبیشتر ٹولیاں ساتھ لے کر طواف شروع کرتے ہیں اور اونچی آواز سے دعائیں پڑھتے ہیں۔ اس شور وشغب میں وہ سکون نصیب نہیں ہوتا جس کا ہر طائف خواہاں ہوتا ہے نیز ایسی ٹولیوں میں دھکا بازی بھی بہت ہوتی ہے۔ ٹولی کا ہر فرد ٹولی کے ساتھ رہنا چاہتا ہے۔ اگر ایک قدم پیچھے ہو جاتا ہے تو دو چار آدمیوں کو دھکے دے کر ہٹاتا اور خود آگے بڑھنے میں ہرگز تامل نہیں کرتا۔ نیز مطوف طواف شروع کرا کے ختم کرتا اور پیسے وصول کرکے دوسری آسامی کو اپنے ڈھب پر لانے کی فکر میں رہتے ہیں اس لیے اکثر وبیشتر تیز چلتے ہیں۔

چار پائی نشین طائفین:

طواف میں ایک بڑی مصیبت ان بوڑھے مردوں یا بوڑھی عورتوں کی وجہ سے پیش آتی ہے جو چار پائیوں پر لیٹ کر طواف کے لیے آتی ہیں۔ ان چار پائیوں کو عموماً دو نکرونی سر پر اٹھائے رہتے ہیں۔ مجھے ایسے طواف کے جواز میں کلام نہیں ہوسکتا لیکن جواز صرف خاص خاص حالتوں تک محدود ہونا چاہیے۔ مثلاً یہ کہ ایک شخص نے عمرہ کا احرام باندھا، راستے میں سخت بیمار ہوگیا اب طواف نہیں کرسکتا۔ تو ضروری ہے کہ وہ چار پائی پر بیٹھ کر طواف کو پورا

کرے یا طواف افاضہ میں اس جواز سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ لیکن میں نے بوڑھے جاویوں کو دیکھا کہ وہ روزانہ اور معمولی طواف کے لیے بھی چارپائیوں پر بیٹھ کر آجاتے ہیں اور مطاف چونکہ زیادہ کشادہ نہیں ہے اس لیے ان ''چارپائی نشینوں'' کی وجہ سے عام طائفین کو بڑی سخت تکلیف ہوتی ہے۔ یہ مصیبت سعی میں بھی موجب اضطراب بنی رہتی ہے۔ بعض لوگ سعی گدھوں یا خچروں پر کرتے ہیں۔ ہجوم کے اوقات میں اس طرح تکلیف ہوتی ہے۔

جاویوں کی نماز:

سب سے زیادہ بری نماز جاویوں کی دیکھی۔ امام تکبیر کہہ کر قرأت شروع کر دیتا اور اکثر جاوی کھڑے ادھر اُدھر دیکھتے رہتے۔ فاتحہ ختم ہو کر سورۃ شروع ہو جاتی تو ان لوگوں کو نیت باندھنے کا ہوش آتا۔ بعض اوقات امام قرأت ختم کر کے رکوع میں چلا جاتا اور جاویوں کی فاتحہ باقی ہوتی۔ یہ بے تکلفی سے کھڑے فاتحہ پڑھتے رہتے۔ اگر وہ ان معاملات میں امام کے ساتھ ہوتے تو رکوع و سجود میں اس کی خلاف ورزی کرتے۔ ایک روز میں رکن شامی کے پاس نماز مغرب ادا کر رہا تھا۔ میرے دونوں طرف دُور دُور تک جاوی کھڑے تھے۔ میں نے انھیں تقریباً ہر رکعت میں امام کے سمع اللہ لمن حمدہ کہنے سے قبل رکوع سے اُٹھتے دیکھا اور اسی طرح سجدوں میں کرتے دیکھا۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ نماز سکھانے والے نے انھیں یہ سکھایا ہے کہ رکوع و سجود میں تین مرتبہ سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْم اور سُبْحَانَ رَبِّیَ الاعلیٰ کہنا چاہیے جب ان کی یہ تسبیحات پوری ہو جاتی ہیں تو امام اللہ اکبر کہے یا نہ کہے، وہ جھٹ سجدے سے یا رکوع سے اُٹھ جاتے ہیں۔ پھر انھیں ہر وقت یہ فکر رہتا ہے کہ جلد سے جلد سلام پھیر کر باقی مسلمانوں سے پہلے حطیم میں دیوار کعبہ کے ساتھ جگہ حاصل کر لیں۔ چنانچہ جس نماز مغرب کا اُوپر ذکر آیا ہے، اس میں میں نے دیکھا کہ میرے پاس یہ لوگ نیت باندھ کر کھانستے بہت ہیں۔ اضطراری کھانسی ایک الگ شے ہے لیکن جاویوں کی حالت تو یہ ہوتی ہے کہ ابھی ایک جاوی کھانسا، اس کے بعد دوسرا اور پھر تیسرا، پھر متعدی مرض کی طرح اکثر کھانسنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس طرح قرأت سننے والوں کو بڑی تکلیف ہوتی ہے اور

وہ امام کے الفاظ پوری طرح سُن نہیں سکتے۔

جاویوں کا شوقِ حج:

لیکن یہ حقیقت ہے کہ جاوی سب سے بڑی تعداد میں حج کے لیے آتے ہیں اور سب سے زیادہ مدت یہاں رہتے ہیں۔ اُن کی عورتیں بھی حج کے لیے اسی شوق سے آتی ہیں، جس شوق سے مرد آتے ہیں، کثرت سے طواف کرتی ہیں، کثرت سے عبادت کرتی ہیں۔ بڑی خدا پرست اور حیادار ہوتی ہیں۔ اُن کے چھوٹے چھوٹے بچے بھی حج کے لیے آتے ہیں۔ تمام ارکان ادا کرتے ہیں اور اپنی ماؤں اور باپوں کی طرح بہ کثرت طواف کرتے ہیں۔ میں ان بچوں کو مطاف میں شوق کے ساتھ طواف کرتے دیکھتا تو جی چاہتا کہ ان معصوم خدا پرستوں کو گلے لگا کر پیار کروں۔

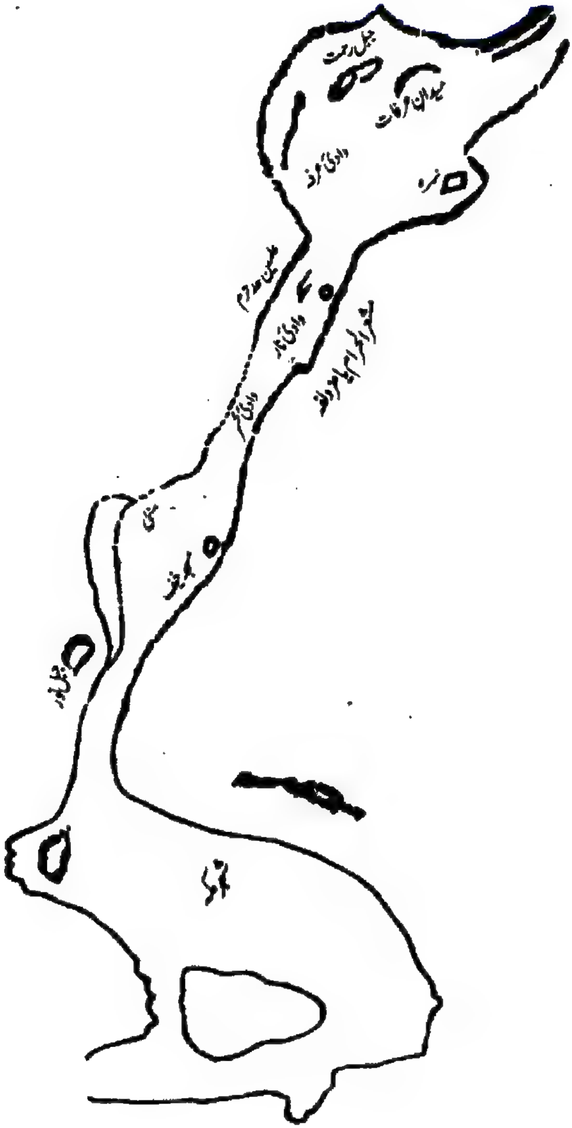
منیٰ:

منیٰ مکہ معظمہ سے تقریباً تین میل کے فاصلے پر ہے۔ عرفات کی طرف پہاڑیوں کا سلسلہ برابر چلا گیا ہے۔ درمیان میں تھوڑا راستہ ہے جو پیچ وخم کھاتا ہوا جاتا ہے۔ اس میں پہلا کشادہ میدان منیٰ ہی ہے۔ مکہ معظمہ سے عرفات کی طرف جاتے ہوئے منیٰ میں داخل ہوں تو سب سے پہلے جمرۃ الاولی یا جمرۃ العقبہ یا بقول مولانا محمد علی بڑا شیطان آتا ہے۔ ذرا اور آگے بڑھیں تو جمرۃ الثانیہ یا منجھلا شیطان۔ ذرا اور آگے بڑھیں تو جمرۃ الثالثہ یا چھوٹا شیطان۔ حضور خواجہ دو جہاں ﷺ کے عہد مبارک میں منیٰ میں کوئی مکان نہ تھا۔ ایک روایت ہے کہ حضرت عائشہؓ نے حضور اکرام ﷺ سے عرض کیا تھا کہ اجازت ہو تو حضور ﷺ کے لیے مکان بنا دیا جائے۔ مگر حضور ﷺ نے منع فرما دیا۔ لیکن اب منیٰ میں بہت سے مکان بنے ہوئے ہیں اور بعض واقف کار اصحاب کے بیان کے مطابق یہ مکان شہر جدہ کے مکانات سے بھی تعداد میں زیادہ ہیں۔ یہ تمام مکانات سال بھر میں خالی رہتے ہیں، صرف حج کے دنوں میں آباد ہو جاتے ہیں۔ مکہ معظمہ کی طرف سے جاتے ہوئے میدان منیٰ میں داخل ہوں تو مکان آجاتے ہیں جو میدان کے کم وبیش ایک ثلث حصے کو گھیرے ہوئے

ہیں۔البتہ دو ثلث حصہ خالی رہتا ہے جہاں حاجیوں کے خیمے لگ جاتے ہیں۔ منیٰ کے مکانات کے آخری حصے میں دائیں جانب عام راستے سے ذرا ہٹ کر مسجد خیف ہے۔ راستے کے بائیں جانب مصری شفاخانہ ہے۔ اس کے سامنے دائیں جانب حجاز پولیس کے خیمے تھے۔ ان خیموں کے ساتھ حکام کے خیمے اور ان سے ذرا آگے بڑھ کر سلطان کے لیے ایک مختصر سا مکان بنا ہوا ہے جس کے گرد وپیش سلطان کی گارد، افسرانِ خصوصی اور اعزہ واقارب کے خیمے تھے۔ عام نجدیوں کے خیمے عموماً میدان کے آخری حصے میں پہاڑوں کے ساتھ ساتھ تھے۔ گویا اس بساط کے حاشیے کا کام دے رہے تھے۔ شاید انھیں حکماً پہاڑوں کے ساتھ ساتھ رکھا گیا ہو تا کہ باہر کے بدو کسی حاجی کو لوٹ نہ سکیں۔ منیٰ میں حج کے ایام میں بے حد رونق ہوتی ہے۔ بہت بڑا بازار لگ جاتا ہے جس میں ہر قسم کی چیزیں مل جاتی ہیں۔ ہزاروں دکانیں کھل جاتی ہیں۔ ہزاروں قہوہ خانے کھل جاتے ہیں۔ صرّافی کی دکانیں لگ جاتی ہیں۔ عرفات جاتے ہوئے آبادی سے آگے نکل کر راستے کے بائیں جانب منحر آتا ہے جہاں حاجی قربانیاں کرتے ہیں

مسجد خیف:

مسجد خیف کے متعلق میں عرض کر چکا ہوں کہ جہاں منیٰ کے مکانات ختم ہوتے ہیں اس مکان کے قریب مکہ معظمہ سے عرفات جاتے ہوئے دائیں ہاتھ پر آبادی سے باہر ہے اور اس سے تھوڑے فاصلے پر اس سمت منیٰ کا میدان ختم ہو جاتا ہے اور پہاڑی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ مسجد مستطیل ہے۔ تقریباً ۷۴ گز چوڑی اور ۹۹ گز لمبی ہے۔ قبلے کی سمت مسقف ہے۔ مسقف حصے کا عرض بارہ گز سے زیادہ نہیں۔ شمالی سمت (یعنی منیٰ کی آبادی کی سمت) میں ایک غیر مسقف دالان ہے صحن میں کوئی فرش نہیں بلکہ باریک سنگریزے بچھے ہوئے ہیں۔ صحن کے تقریباً وسط میں ایک مختصر سا قبہ ہے کہتے ہیں کہ حضرت خواجہ دو جہاں ﷺ نے حجۃ الوداع میں یہیں نماز ادا فرمائی۔ لیکن اسمٰعیل نے مجھے بتایا کہ اہل حدیث کی تحقیق کے مطابق حضور ﷺ کے نماز ادا کرنے کی جگہ اس وقت مسجد سے باہر ہے اور اس کے جنوبی


جبل رحمت
میدان عرفات
وادی عرنہ
نمرہ
علمین حد حرم
مشعر الحرام یا مزدلفہ
منیٰ
مسجد خیف
مکہ

دیوار سے ملحق ہے۔ مسجد خیف کی عمارت اچھی نہیں ہے۔ منیٰ کا میدان جہاں ختم ہوتا ہے وہاں سے پھر دونوں طرف کی پہاڑیاں قریب آجاتی ہیں اور مزدلفہ کے میدان تک اسی طرح چلی جاتی ہیں۔ مزدلفہ اور منیٰ کے درمیان بھی تقریباً تین ساڑھے تین میل کا فاصلہ ہے راستے میں وادیٔ محسر آجاتی ہے اور وادی محسر سے آگے وادی نار ہے۔ وادی نار وہ مقام ہے جہاں اصحابِ فیل تباہ ہوئے تھے۔ اَلَمْ تَرَ کَیْفَ فَعَلَ رَبُّکَ بِاَصْحَابِ الْفِیْلِ

مزدلفہ، عرفہ اور عرفات:

مزدلفہ پہنچ کر میدان پھر کھل جاتا ہے۔ یہاں محض ایک مختصر سی مسجد ہے جس کے درمیان میں ایک منارہ ہے اور کوئی عمارت نہیں ہے۔ مزدلفہ سے تقریباً چار میل پر حدِ حرم کے علم ہیں علموں کے ساتھ ہی وادی عرفہ ہے جس میں مسجد نمرہ یا مسجد ابراہیم واقع ہے۔ وادی عرفہ کا عرض دو اور تین فرلانگ کے قریب ہوگا۔ اس کے بعد میدان عرفات کی حد شروع ہوجاتی ہے۔ عرفات کا میدان اور وادی عرفہ مل کر بہت کشادہ اور وسیع جگہ بن جاتی ہے۔ عرفات کے میدان میں دو تین چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں ہیں جن میں سب سے زیادہ قابلِ ذکر جبلِ رحمت ہے۔ اس پہاڑی کے پائیں میں حجاج کھڑے ہو کر دُعائیں مانگتے ہیں۔ مسجد نمرہ کے پاس ایک بہت بڑا کنواں ہے جو حال ہی میں بنا ہے جبل رحمت کے قریب پانی کے بڑے بڑے حوض ہیں اور جبل کے ساتھ ساتھ عین زبیدہ کا پانی جاتا ہے۔ مسجد نمرہ یا مسجد ابراہیم خیف سے چھوٹی ہے۔ اس کے وسط میں ایک رقبہ ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس مقام پر حضور خواجہ دو جہاں ﷺ نے حجۃ الوداع کے دن نماز ادا فرمائی تھی یا بہ الفاظ صحیح تر ظہر وعصر کو جمع کیا تھا۔ یہ مسجد بھی قبلے کی سمت سے مسقف ہے۔ اس کا فرش مسجد خیف سے بھی بری حالت میں ہے۔

نہر زبیدہ:

مکہ معظمہ اور اس کے حوالی کے بیان میں اب صرف ایک ضروری اور خاص طور پر قابل ذکر شے باقی رہ گئی ہے۔ یہ عین زبیدہ یا نہر زبیدہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مکہ معظمہ وادی غیر

ذی زرع میں آباد ہوا عرب اسلام کی دولت سے مالا مال ہو کر دُنیا کو دین قیم کا سبق دینے کے لیے باہر نکلے اور بڑی بڑی سلطنتیں ان کے قدم چومنے لگیں تو انھوں نے مکہ معظمہ کو پانی سے سیراب کرنے اور زائرین وحجاج کو آرام پہنچانے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ غالباً بنو اُمیہ کے زمانے میں جعرانہ کے قریب کی ایک پہاڑی کے چشمہ میں سے متعدد نہریں بنائی گئیں اور مکہ معظمہ کے علاوہ عرفات میں بھی پانی پہنچانے کا انتظام کیا گیا۔ لیکن بنو امیہ کے زوال پر سب نہریں خراب ہو گئیں، تمام چشمے بے کار ہو گئے اور حاجیوں کو سخت تکلیف ہونے لگی عباسیوں نے ابتدائی عہد میں پانی کے انتظامات کو درست کرنے کی بہت کوشش کی مگر کوئی تسلی بخش صورت پیدا نہ ہوئی ۱۹۳ھ میں خلیفہ ہارون الرشید کی محبوب بیگم زبیدہ خاتون نے حج کیا اور حاجیوں کی تکالیفؒ کا اسے احساس ہوا تو اس نیک اور خدا پرست خاتون نے پانی کے انتظامات کو زیادہ مستقل صورت دینے کی کوشش کی۔ اس نے اپنی جیب سے روپیہ دیا۔ مہندسوں کو طائف وعرفات کے درمیانی پہاڑوں میں بھیجا، آخر حنین کے قریب ایک چشمہ ملا۔ اس کو مرکز ومنبع بنا کر نہر بنائی اور راستے کے دوسرے چشموں کو بھی اس کے ساتھ ملا دیا

بہترین خیرِ جاریہ:

یہ وہ نہر ہے جو ساڑھے گیارہ سو سال سے حرم پاک میں خیرِ جاریہ کا بہترین عمل شمار ہوتی چلی آتی ہے، اور جس کا نام زبیدہ خاتون کے نام کو تا قیامت زندہ رکھے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ مکہ معظمہ میں شاید ہی کسی شخص کا نیک عمل بارگاہِ ایزدی میں اس درجہ مقبول ہوا ہو جیسا کہ زبیدہ خاتون کا یہ عمل قبول ہوا۔ لاکھوں حاجی ہر سال اس نہر کے پانی سے سیراب ہوتے ہیں۔ مکہ کی دو لاکھ آبادی کا بیشتر حصہ روزانہ اس سے سیراب ہوتا ہے۔ لاکھوں اونٹ اور دوسرے جانور اس سے سیراب ہوتے ہیں۔ یہ نہر اپنے مرکز سے چل کر وادی عرفات تک زمین کے اندر اندر آتی ہے۔ عرفات پہنچ کر سطح کے برابر پہنچ جاتی ہے اور پھر مکہ تک کہیں زمین کے اندر کہیں باہر!

منتظمین کی کمیٹی:

اس نہر کے انتظام کے لیے مستقل کمیٹی بنی ہوئی ہے جس میں شیخ عبیداللہ دہلوی اور شیخ

عبدالحمید ہندی بھی شریک ہیں۔ کمیٹی پہلے بھی قائم تھی لیکن شریف حسین کے آخری زمانے میں یہ بالکل معطل ہو گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ شریف حسین کے عہدِ حکومت کے آخری دو برسوں میں پانی کی قلت کے باعث حاجیوں کو سخت تکلیف ہوئی۔ سلطان ابن سعود مکہ معظمہ آئے تو انھوں نے بہت بڑی رقم اپنی گرہ سے صرف کر کے نہر کو نجدیوں کے ذریعے سے صاف کرایا۔ اس کے بعد کمیٹی کو حقیقۃً کارکن کمیٹی بنایا۔ اب کمیٹی کو مختلف ذرائع سے تقریباً بیس ہزار پونڈ سالانہ مل جاتے ہیں۔ یہ ساری رقم عین زبیدہ کی شاخوں کی توسیع، اصل نہر کی اصلاح و وسائل بہم رسانی آب کی افزائش وغیرہ میں صرف ہوتی ہے۔ شیخ عبدالحمید صاحب نے مجھے منیٰ میں بتایا کہ جعرانہ کے قریب جو پرانے چشمے تھے، ان کی صفائی بھی شروع ہو گئی ہے اور نہریں صاف کی جاری رہی ہیں۔ اس طرح اُمید ہے کہ ان شاء اللہ چند سالوں میں عین زبیدہ کی کمیٹی پانی کے مسئلے کو خدا کے فضل سے ہمیشہ کے لیے حل کر دے گی۔ اب بھی پانی بکثرت ملتا ہے اور ہر جگہ ملتا ہے۔ ہرگز کسی کو کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔

میں مکہ معظمہ اور اس کے حوالی کا بیان ختم کر کے سفرِ حج کی چھوڑی ہوئی داستان کو ازسرِ نو شروع کروں گا۔ (یہ تذکرہ) یہاں اس لیے ضروری تھا کہ سفرِ حج کے حالات سے قارئین کرام اچھے طریقے پر محظوظ ہو سکیں۔

(انقلاب: ۲۴ر جون ۱۹۳۰ء ص ۲ تا ۴)

باب پنجم

حرم پاک کا ظالم کلید بردار

حرمِ پاک کی زیارت کے سلسلے میں جو چیز ہماری پارٹی کے لیے اور عام حاجیوں کے لیے سب سے زیادہ تکلیف دِہ، دل آزار، رنج افزا تھی، وہ عبدالقادر شیبی کلید برادر حرمِ پاک کا ظالمانہ و بے دردانہ طرزِ عمل تھا۔ روپے سے ہر شخص کو کم یا زیادہ محبت ہوتی ہے۔ محض جمع و فراہمی کے لیے نہ سہی، ضروریات کی تکمیل ہی کے لیے سہی، لیکن عبدالقادر شیبی جلب زر کا ایک ایسا مکروہ پیکر ہے کہ شاید ہندوستان کے بڑے بڑے پشتینی سود خور بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ سُنا جاتا ہے کہ ترکوں کے زمانے میں اور شریف حسین کے عہد میں اس ظلم و جبر کی کوئی حد نہ تھی۔ ہر حاجی سے داخلہ بیت کے وقت یہ من مانی رقم وصول کرتا تھا اور جو غریب رقم ادا نہیں کر سکتا تھا اس کے لیے داخلہ ممنوع تھا۔ اس زمانے میں اسے استار کعبہ میں سے صرف غلاف ملتا تھا۔ حزام، برقعہ باب اور پردہ مقام ابراہیم شریف کے پاس پہنچ جاتا تھا۔ جو زری کی ان بیش قیمت چیزوں کو تحائف کے طور پر دولت مندوں میں تقسیم کیا کرتا تھا۔ سلطان ابن سعود آئے تو انھوں نے حزام، برقعہ اور مقام ابراہیم کا غلاف بھی شیبی کو دے دیا۔ یہ سب چیزیں وہ حاجیوں کے پاس فروخت کرتا ہے۔ اس کے علاوہ تیس پونڈ ماہانہ تنخواہ مقرر کر دی لیکن شرط یہ لگائی کہ کسی حاجی سے داخلہ بیت کے وقت کچھ نہ وصول کیا جائے، البتہ کوئی شخص خوشی سے کچھ دے دے تو اسے قبول کر لیا جائے۔ لیکن شیبی نے ایک آدھ سال کے بعد ہر عہد کو توڑ دیا اور اب داخلہ بیت نہایت بے دردانہ زدوکوب کا ایک ذریعہ بن گیا ہے۔ شروع شروع میں میں نے مختلف اشخاص سے اس کے متعلق شکایات سنیں

لیکن یقین نہ آیا۔ یہ بات تصور میں نہیں آتی تھی کہ مسجد الحرام کے اندر بابِ مقدس کے سامنے کوئی شخص حاجیوں کو بے دردی سے زدوکوب کر سکتا ہے۔ میں نے خیال کیا کہ شاید داخل ہونے والوں نے کسی وقت ہجوم کیا ہوگا اور اس ہجوم کو روکنے کے لیے ممکن ہے کسی شخص نے چھڑی استعمال کی ہو!

زدوکوب کا دردناک منظر:

لیکن ایک روز میں صبح کے وقت طواف کے لیے گیا۔ طواف کر رہا تھا کہ داخلہ بیت اللہ کا دروازہ کھلا اور لوگوں پر چھڑیاں برسنے لگیں۔ میں تقریباً آدھ گھنٹہ مقام ابراہیم کے پاس کھڑا یہ دردناک منظر دیکھتا رہا۔ شیبی دروازے کے اندر ایک صندوق پر بیٹھا تھا اور اُس کا بیٹا دروازے کی دہلیز پر بیٹھا تھا۔ اس کے ساتھ شیبی کے تین چار آدمی بید ہاتھ میں لیے کھڑے تھے۔ جو شخص شیبی کے ہاتھ میں روپے دے دیتا اسے بازو سے پکڑ کر اوپر اُٹھا لیا جاتا اور اندر داخل ہونے دیا جاتا، جو نہ دیتا یا کم دیتا اور اوپر چڑھنے کی کوشش کرتا اُسے بیدوں سے مار مار کر نیچے گرا دیا جاتا۔ غصے اور غضب سے میری آنکھوں میں خون اُتر آیا لیکن کچھ نہیں کر سکتا تھا اور خاموش گھر چلا آیا۔ چوتھے پانچویں روز حضرت سلطان المعظم سے ملاقات ہوئی تو میں نے تفصیل کے ساتھ واقعہ لکھ کر حضرت کی خدمت میں پیش کر دیا۔ ارشاد ہوا، اس کا انتظام کیا جائے گا۔

سدانت بیت کا منصب:

میں نے سنا کہ شیبی حقیقۃً اس خاندان کا جائز وارث نہیں ہے۔ جس کے جدامجد کو حضور سرورِ کائنات ﷺ نے فتح مکہ کے موقع پر بیت اللہ کی کنجیاں عنایت فرمائی تھیں اور ارشاد فرمایا تھا کہ تم سے جو شخص یہ کنجیاں چھینے گا وہ ظالم ہوگا (اوکما قال)

حضرت سلطان المعظم شیبی کے معاملے میں سختی کرنے میں کسی وجہ سے متامّل ہیں، وہ خیال فرما رہے تھے کہ خواہ مخواہ ان پر تہمت لگائی جائے گی۔ لیکن میں نہیں سمجھتا کی حضور سرورِ کائنات ﷺ کا منشائے مبارک یہ تھا کہ شیبی کے خاندان کا کوئی وارث حرم پاک کے داخلہ کو

جلب زر کا ذریعہ بنائے اور حاجیوں کو بے دردی کے ساتھ مارے تو اس حالت میں بھی اس سے کنجیاں نہ لی جائیں اور سدانت بیت کا منصب نہ چھینا جائے۔ واقف کار اصحاب بیان کرتے ہیں کہ خاندان شیبی کے دو حقیقی وارث اس وقت تک موجود ہیں، جن میں سے ایک یمن میں رہتا ہے اور دوسرا مراکش میں، اور دونوں نے منصب سدانت کا دعویٰ کر رکھا ہے۔ عبدالقادر شیبی حقیقۃً خاندان بنی شیبہ کا غلام یا کنیز زادہ ہے (واللہ اعلم بالصواب)۔

ایک روز ہم داخلے کے لیے گئے تو ہمیں بغیر کچھ دیے اجازت مل گئی۔ اس لیے کہ اسمٰعیل ساتھ تھا۔ دوسرے روز اسمٰعیل نے چند اصحاب کے داخلے کے لیے ایک خط شیبی کے پاس بھیجا تو ان لوگوں کو بھی جزیہ ادا کیے بغیر داخل ہونے کی اجازت مل گئی۔ لیکن اس کے داخلے کے دوسرے روز صبح کے وقت شیبی کا رقعہ پہنچ گیا کہ اگر اس طرح لوگ بیت اللہ میں داخل ہوتے رہے تو ہمارے کھانے پینے کا کیا بندوبست ہوگا۔ یہ گویا اسمٰعیل کو ایک مہذب انتباہ تھا کہ آئندہ پیسوں کے بغیر داخلے کے لیے کسی کی سفارش نہ کرو۔ شیبی کا یہ خط ہمارے پاس موجود ہے۔

شیبی کی موجودہ آمدنی:

اس کے بعد مجھے شیبی کی آمدنی معلوم کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ اس کی مجمل کیفیت یہ ہے:

غلافِ کعبہ..................................	پانچ ہزار پونڈ سالانہ
برقعہ و حزام..................................	چار ہزار پونڈ سالانہ
تنخواہ..................................	تین سو ساٹھ پونڈ سالانہ
غلاف کے رسے اور استر..............	سو پونڈ سالانہ
مقام ابراہیم کا غلاف..................	تین سو تینتیس پونڈ سالانہ (غلاف ایک ہزار پونڈ میں بکتا ہے اور تین سال کے بعد بدلا جاتا ہے)
جاویوں کے نام رکھنے کے لیے......	کم از کم دس ہزار پونڈ سالانہ (جاوی حجاز پہنچ کر عربی نام رکھتے ہیں)

یہ ساری رقم انیس ہزار سات سو ترانوے پونڈ بنتی ہے۔ پونڈ کے موجودہ نرخ (ساڑھے تیرہ روپے فی پونڈ) سے دو لاکھ پینسٹھ ہزار دو سو بیالیس روپے آٹھ آنے۔ اس سال شیبی نے حجاج سے جو رقم بطور جزیہ وصول کی اس کا اندازہ کم از کم پندرہ ہزار پونڈ یا دو لاکھ ڈھائی ہزار روپے ہے۔ اس کے علاوہ شیبی کو ساڑھے بارہ سو روپے مملکت آصفیہ سے ملے ہیں۔ڈھائی سو روپے ماہوار بھوپال سے، ڈھائی سو روپے ماہوار بہاول پور سے، دو سو یا ڈھائی سو روپے رام پور سے اور ایسے ہی ہندوستان کی کئی اور اسلامی ریاستوں سے، اس کے لیے وظیفے مقرر ہیں۔ جو لوگ بہ طیب خاطر اس کے لیے ہدیہ لاتے ہیں، وہ اس کے علاوہ ہیں۔مکہ معظمہ میں اس کے کئی مکانات ہیں، مسعیٰ میں جو مکان ہے وہ کم از کم دو لاکھ پونڈ کا ہوگا۔ باہر دیہات میں کئی باغات، کئی محل اور کئی سیر گاہیں ہیں۔طائف میں چار عالی شان مکانات ہیں اور لاتعداد زمینیں ہیں۔ اس کے مکان میں جو روپیہ دفن ہے اس کا کوئی حد و شمار نہیں۔ ایسے شخص کا حاجیوں کو روپیہ وصول کرنے کے لیے مارنا ایسا ظلم قبیح ہے جسے ایک لمحے کے لیے بھی میں برداشت نہیں کر سکتا۔حکومت حجاز کا فرض ہے کہ وہ اولین فرصت میں اس شخص کے ظلم کا سدِ باب کرے۔

حرم پاک میں صریح ظلم:

ہمیں معلوم تھا کہ شیبی داخلے کے لیے تین روپے فی کس وصول کرتا ہے۔ لیکن خواجہ غلام محمد صاحب نے بتایا کہ تین روپے تو دروازے کے اندر جانے کے ہیں۔ اندر جاتے ہی پھر فیس وصول کی جاتی ہے اور بیت اللہ کے اندر سے جو سیڑھی اُوپر جانے کے لیے ہے، اس پر پردہ ڈال کر اسے "باب توبہ" قرار دیا جاتا ہے اس کے پاس دُعا مانگنے کے دو روپے الگ لیے جاتے ہیں۔غلام محمد نے آٹھ روپے ادا کر کے داخلہ بیت کے تمام مراحل طے کیے۔بیتِ کعبہ کی دہلیز مبارک مطاف کی سطح سے قدِ آدم اونچی ہے بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص کم رقم دے کر اُوپر چڑھنا شروع کر دیتا ہے۔ شیبی کو یا اس کے بیٹے کو جب معلوم ہوتا ہے کہ رقم کم دی گئی ہے تو وہ اپنے آدمیوں کو حکم دیتا کہ فلاں شخص کو مارو اس وقت

تک غریب حاجی دہلیز تک پہنچ جاتا ہے۔ اس پر چھڑیاں برستی ہیں۔ اس بے دردی سے برستی ہیں کہ وہ بے چارہ مجبور ہو کر نیچے گر جاتا ہے سُنا جاتا ہے کہ پچھلے سال ایک حاجی گر گیا اور اس کا سر پھٹ گیا۔ بعد ازاں اُس کا انتقال ہو گیا۔

حکومتِ حجاز اور اسلامی ریاستوں کا فرض:

یہ ظلم و جبر عبدالقادر شیبی ہی تک محدود نہیں بلکہ اس کا بیٹا (جو موجودہ حالات کے اختتام کی صورت میں کلید بردار بنے گا اور جو عملاً اب بھی کلید برداروں کی اکثر خدمات انجام دیتا ہے) بھی ویسا ہی ظالم ہے، ویسا ہی شقی القلب ہے، بلکہ ایک روز میں نے شیبی کے پوتے کو بھی جس کی عمر بمشکل دس سال کی ہوگی، اس ظلم و جبر کی تعلیم پاتے اور اس کی ابجد پر عمل کرتے دیکھا۔ حکومت حجاز کا فرض ہے کہ وہ سدانت کے مقدس عہدے کو ایسے ظالم شخص کے ہاتھ میں نہ چھوڑے۔ اس سلسلے میں اسلامی ریاستوں کا بھی فرض ہے کہ اپنے ہاں کے ذمہ دار حاجیوں سے میرے محولہ بالا بیانات کی تصدیق کریں، اور کم از کم اس وقت شیبی کا وظیفہ ضرور روک دیں۔ جب تک جبراً روپیہ وصول کرنے اور حاجیوں کو مارنے کا سلسلے بند نہ ہو۔ موجودہ حالت میں وظیفہ کا اجرا حقیقی حالات کے انکشاف کے بعد ضرور تعاون علی الاثم کی حیثیت رکھتا ہے۔ میں اس باب میں مفصل مضامین لکھنا چاہتا ہوں اور ان شاء اللہ اولین فرصت ہی میں یہ فرض انجام دوں گا۔

(انقلاب: ۲۹ر جون ۱۹۳۰ء ص ۴)

باب ششم

ادائے فریضۂ حج

مقامات حج کے اجمالی ذکر کے بعد اب میں اپنے حالات سفر کا رشتۂ بیان دوبارہ سنبھالتا ہوں۔ میں واقعات جدہ کے سلسلے میں عرض کر چکا ہوں کہ ہماری جماعت متفرق ہو چکی تھی۔ سیٹھ عبدالشکور اپنی باگ اپنے ماموں کے ہاتھ میں دے چکے تھے۔ حاجی صدیق اگرچہ مکہ معظمہ میں خود مختار تھے مگر وہ اپنے رفقا کو چھوڑ نہیں سکتے تھے اور ان کے انتظامات معلم کے ہاتھ میں تھے، وہ ہماری طرح نہ تھے جن کا کوئی معلم نہ تھا۔

حج کا مسنون طریقہ:

حج کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ ۸ر ذی الحجہ کو ظہر کی نماز منیٰ میں ادا کی جائے۔ ظہر، عصر، مغرب اور عشا کی نمازیں وہیں ادا ہوں۔ رات کو منیٰ ہی میں قیام کیا جائے اور ظہر کی نماز ادا کر کے عرفات جائے۔ ظہر اور عصر ملا کر وادی عرفہ میں پڑھی جائیں۔ پھر غروب آفتاب تک عرفات میں وقوف کیا جائے۔ غروب کے وقت عرفات سے چل کر رات مزدلفہ یا مشعر الحرام میں گزاری جائے۔ وہاں صبح کی نماز ادا کرنے کے بعد منیٰ میں آئے۔ جمرۃ الاولیٰ پر کنکریاں پھینکے، قربانی کرے۔ حلق یا قصر کرا کے احرام کھولے۔ بعد ازاں اسی دن مکہ معظمہ پہنچ کر طواف افاضہ کرے۔ مغرب کے وقت پھر منیٰ میں پہنچ جائے اور ایام تشریق وہیں گزارے۔ مگر بہت کم لوگ مسنون طریقے پر حج کرتے ہیں۔ اکثر حاوی ۵ر ہی کو منیٰ چلے جاتے ہیں۔ عام حاجی کثیر تعداد میں ۷ر تک روانہ ہو جاتے ہیں اور بعض تو ۵ر کو عرفات پہنچ جاتے ہیں۔ بہت سے حاجیوں کو معلم بھی تنگ کرتے ہیں وہ اُونٹوں والوں کے ساتھ ساز باز

کر لیتے ہیں۔ اونٹ والوں کو پیسے کا لالچ ہوتا ہے چار پانچ لاکھ آدمیوں کے لیے ۸/ ہی کو ہر قسم کی سواریاں مہیا نہیں ہو سکتیں، لہٰذا اکثر کا شیوہ ہے کہ ۵/ ہی کو حاجیوں کو لاد لاد کر لانا شروع کر دیتے ہیں اور اس طرح کئی پھیرے کر لیتے ہیں۔ حافظ محمد صدیق صاحب نے اپنے لیے اور اپنے رفقا کے لیے اونٹوں کا بندوبست کر لیا تھا اور ۸/ کی صبح کو مکہ معظمہ سے روانہ ہو کر منیٰ پہنچ گئے۔ سیٹھ عبدالشکور کے ماموں کا اصرار تھا کہ سیٹھ صاحب ۷/ کو منیٰ چلے چلیں، لیکن سیٹھ صاحب دل میں فیصلہ کر چکے تھے کی حتی الامکان مسنون طریقے سے حج کریں۔ چنانچہ انھوں نے ۸/ کو اپنے ماموں صاحب کا ساتھ چھوڑا اور ہمارے پاس آ گئے۔ اس لیے کہ دوستی کی جاذبیت کے علاوہ انھیں یقین تھا کہ ہم لوگ ضرور سنت کے مطابق حج کریں گے۔ چنانچہ حج میں ۱۰/ تاریخ تک سیٹھ صاحب ہمارے رفیق رہے۔ ڈپٹی صاحب مستقلاً ہمارے رفیق تھے۔ اگرچہ عملاً آدھے رفیق تھے۔ اس لیے کہ کبرسنی کے باعث ہماری ہنگامہ خیزیوں میں شریک نہیں رہ سکتے تھے۔ خواجہ غلام محمد دارالکسوہ سے ہمارے رفقا میں شامل ہو گئے تھے۔

پروفیسر عبدالحی عرب:

سفرِ حج میں ایک اور صاحب ہماری پارٹی میں شریک ہوئے، جن کی نسبت یہاں قدرے تفصیل کے ساتھ چند باتیں بتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یہ صاحب ہماری پارٹی کی رونق، دلچسپی اور راحت کا ایک نہایت گراں مایہ خزینہ تھے۔ یہ صاحب پروفیسر عبدالحی عرب تھے۔ جن کا ذکر سلطان المعظم کی دعوت کے سلسلے میں آ چکا ہے

پروفیسر صاحب سیّد ہیں، خالص عرب ہیں مجرہ کے رہنے والے ہیں۔ نوجوانی کے عالم میں اپنے خاندان کے ایک بزرگ کے ساتھ سیاحت کی غرض سے ہندوستان چلے گئے جہاں مولانا حکیم نور الدین بھیروی ثم قادیانی کے علم و فضل اور حُسنِ اخلاق سے مسحور ہو کر ان کے پاس رہ گئے اور عمر کا بڑا حصہ حکیم صاحب ہی کے پاس گزرا۔ حکیم صاحب ان سے اپنے بچوں کی طرح محبت کرتے تھے۔ پروفیسر عبدالحی صاحب نے پنجاب یونیورسٹی سے منشی منشی

عالم ،منشی فاضل ،مولوی ،مولوی عالم ،مولوی فاضل کی سندیں لیں۔طب پڑھا اور اس میں کمال حاصل کیا بہ طور خود طبقات الارض ،فلسفہ اور ہیئت کا وسیع مطالعہ کیا۔ پھر جراحی کی تعلیم کے لیے نیویارک چلے گئے۔ حکومت امریکہ نے انھیں ایرانی جاسوس سمجھ کر اپنی حدود میں داخلے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔مجبوراً پروفیسر صاحب انگلستان چلے آئے اور آکسفورڈ یونیورسٹی میں عربی و فارسی کے پروفیسر بن گئے ،عبرانی زبان میں انھیں درجہ فضلیت حاصل ہے عربی و فارسی ان کی مادری زبانیں ہیں ،اُردو ہندوستان میں سیکھی، انگریزی پہلے جانتے تھے اور اب کئی سال سے مستقلاً انگلستان میں مقیم ہیں اور چونکہ وہاں ایک مشہور یونیورسٹی کے اُستاد ہیں ، اس لیے یہ کہنے کی ضرورت نہیں رہتی کہ کس قدر انگریزی جانتے ہیں۔ حکیم نورالدین مرحوم سے آپ کو اس درجہ عقیدت ہے کہ میں نے کبھی کسی شخص کو اپنے محسن ،بزرگ اور شفیق استاد کا اتنا عقیدت مند نہیں دیکھا۔کوئی بات ہو،کوئی گفتگو ہو،کوئی موضوع بحث ہو،پروفیسر صاحب بولیں گے تو ضرور ایک آدہ مرتبہ فرمائیں گے کہ حکیم نور الدین مرحوم نے یوں فرمایا تھا اور یوں کہا تھا میں نے ان کی زبان سے حکیم صاحب مرحوم کی زندگی کے بہت سے ایسے واقعات سُنے جو آج کل بڑے بڑے انسانوں کی زندگیوں میں بھی نہیں پائے جاتے۔ حکیم صاحب مرحوم نے دومرتبہ پروفیسرعبدالحی کی شادی کرائی۔ دونوں مرتبہ بیویوں کا انتقال ہو گیا۔

شوقِ جمع کُتب اور شوقِ مطالعہ:

پروفیسر صاحب کو کتابوں کے جمع کرنے اور پڑھنے کا بے حد شوق ہے ،اس اعتبار سے سارے سفر میں صرف وہی ایک شخص میرے حقیقی محب و رفیق تھے۔ وہ عام طور پر دھوپ سے گھبرا جاتے ہیں اور باہر نہیں نکلتے۔ لیکن ایک روز میں نے کہا کہ باب السلام میں بڑی عمدہ کتابیں ملتی ہیں تو بارہ بجے دوپہر کو کپڑے پہن کر میرے ساتھ ہو لیے اور کتابیں خرید لائے۔ وہ جو کتاب شروع کرتے ،اوّل سے آخر تک اس کا ایک ایک لفظ پڑھتے ہیں۔ ایک روز کہنے لگے کہ حکیم نور الدین مرحوم نے فرمایا تھا کہ تم جس کتاب کو پڑھو،شروع سے لے

کر آخر تک پڑھو۔ تمھارا پڑھنا کسی حالت میں بھی خالی از فائدہ نہ ہوگا۔ پروفیسر صاحب بے حد علم دوست، مطالعۂ کتب کے بڑے شوقین اور اہل علم کی طرح تنہائی پسند آدمی ہیں۔ ہنگامہ آرائی کو پسند نہیں کرتے۔ ان کی دو چیزیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ سونا یا مطالعہ کرنا جب دیکھو تنہا بیٹھے یا تو کتاب پڑھتے رہتے ہیں یا سو جاتے ہیں۔ پروفیسر عبدالحی صاحب کا اندازِ کلام بے حد دلکش ہے۔ خاص طور پر جب وہ اُردو میں بات چیت کرتے ہیں۔ بڑے غیرت مند مسلمان ہیں، عربوں کو دوبارہ اوج کمال پر دیکھنے کے آرزو مند ہیں۔ چوں کہ بے حد مخلص دوست اور نیک بزرگ ہیں اس لیے اکثر ادبی حلقوں میں انھیں عزت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ ہندوستان میں کاٹھیاواڑ کے علاقے میں بعض بڑے بڑے اہل ثروت و جاہ ان کے بے حد عقیدت مند ہیں۔ ایک روز اپنے مولوی فاضل بننے کا واقعہ سنانے لگے، کہنے لگے کی مولوی ثناء اللہ صاحب امرتسری سے میں باتیں کر رہا تھا تو مولانا ے موصوف نے فرمایا کہ میں تمھارے ساتھ بات نہیں کرتا اس لیے کہ تمھارے پاس کوئی ڈگری نہیں ہے۔ یہ سنتے ہی میں (پروفیسر صاحب) نے امتحان دینے شروع کر دیے اور پچاس فی صد نمبر لے کر مولوی فاضل بن گیا۔ جب مجھے ڈگری مل گئی تو مولانا ثناء اللہ صاحب کے پاس گیا اور کہا کہ میں پچاس فی صد نمبر لے کر مولوی فاضل بنا ہوں۔ آیئے اب میرے ساتھ بات کیجیے۔ اس پر مولانا ثناءاللہ نے کہا کہ جاؤ تم میری وجہ سے مولوی فاضل بن گئے ہو۔ کیا میرا اتنا احسان کافی نہیں ہے۔

پروفیسر عبدالحی بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں۔ جن میں سے کئی کتابیں ہندوستان میں چھپ چکی ہیں۔ اس دفعہ آپ نے حجاز کے حالات پر ایک کتاب لکھی ہے۔ جس کا نام ہے ''تحفۂ ملک الحجاز''۔ اس کتاب کو چھپوانے کی تیاری کر رہے ہیں۔ سات مرتبہ حج کر چکے ہیں۔ خواجہ کمال الدین اور لارڈ ہیڈ لے حج کے لیے آئے تھے تو پروفیسر صاحب ہی کو اپنا ترجمان بنا کر لے آئے تھے۔ پچھلے سال بھی پروفیسر صاحب نے حج کیا تھا اور اب کے بھی حج کیا۔ غالباً آیندہ سال بھی حج کے موقع پر حجاز آئیں گے۔

منیٰ کی طرف روانگی:

پروفیسر صاحب ہمارے آنے سے تقریباً ڈیڑھ ماہ قبل حجاز پہنچ چکے تھے اور دارالکسوہ میں مقیم تھے۔ ہم بھی دارالکسوہ ہی میں ٹھہرے تھے۔ اس لیے پروفیسر صاحب ہمارے مستقل رفیق بن گئے۔ جلالۃ الملک نے ایک خاص وقت میں موٹریں منیٰ لے جانے کی اجازت دے دی تھی۔ ہم بھی موٹر میں جانے کا فیصلہ کر چکے تھے لیکن جب رفقا کی تعداد بڑھ گئی تو مجبوراً ہمیں ارادہ بدلنا پڑا۔ ۸/ذی الحجہ کی صبح کو ہمارے پاس سامان کے لیے سواری کے لیے اونٹ آ گئے۔ دارالکسوہ کے تمام کاری گر، خان محمد خان صاحب مع اہل و عیال حج کے لیے جا رہے تھے۔ ہمارے اونٹ بھی ان کے قافلے میں شریک ہو گئے۔ ظہر کے وقت ہم سب احرام باندھ چکے تھے۔ میں نے تجویز پیش کی کہ منیٰ قریب ہے لٰہذا بہتر یہ ہے کی ڈپٹی صاحب کو خان صاحب کے ساتھ چھوڑ دیں اور باقی سب پیدل منیٰ چلیں۔ اس تجویز کو سب نے پسند کیا اور ساڑھے تین بجے کے قریب ہم دارالکسوہ سے نکل کر منیٰ کی طرف چل پڑے۔

گدھوں کی سواری:

جنت المعلیٰ کے قریب پہنچے تو کرایہ کے گدھوں کی قطاریں نظر آئیں۔ ہندوستان میں گدھے کی سواری ذلت کا باعث سمجھی جاتی ہے لیکن حجاز میں گدھا گھوڑے سے بدرجہا زیادہ سواری کے کام آتا ہے۔ گدھوں کو دیکھ کر ہمارے بعض ساتھیوں کی رائے بدل گئی اور قرار پایا کہ اگر مناسب کرائے پر فیصلہ ہو جائے تو منیٰ تک گدھوں پر چلیں۔ ایک ایک ریال فی گدھے پر فیصلہ ہو گیا (سعودی ریال ایک روپے چھ آنے کا ہوتا ہے) ہم سب یعنی پروفیسر عبدالحی عرب، اسماعیل، میں، سیٹھ عبدالشکور، خواجہ غلام محمد اور دارالکسوہ کا چراغ دین پہلوان گدھوں پر سوار ہو گئے۔ یہ بڑا دلکشا منظر تھا۔ ہم میں سے کسی کو گدھوں کی سواری کا تجربہ نہ تھا۔ ہمارے سوار ہوتے ہی گدھوں نے حسب عادت (یعنی حسب عادت خرانِ حجاز نہ کہ حسب عادت خرانِ ہند) بھاگنا شروع کر دیا۔ اس وقت منیٰ کا راستہ شغدف والے اونٹوں،

سامان والے اونٹوں، سانڈنیوں، گدھوں، خچروں اور پیدل چلنے والے تکبرانیوں سے لبریز تھا۔ ہمارے گدھے بھاگنے لگے تو بہ حالت سراسیمگی طریق (یعنی راستہ راستہ) پکارنے کے سوا اور کوئی مشغلہ ہی باقی نہ رہا۔ سب نے احرام باندھ رکھے تھے اور آپ خود خیال فرما سکتے ہیں کہ ہنگامہ خیز سواری کے اوقات میں احرام کا لباس کچھ زیادہ ساتر لباس نہیں ہے۔ کم از کم ہم میں تو یہ طاقت نہ تھی کی اسے ساتر رکھ سکتے۔ گدھے بھاگتے تھے تو ہر لحظہ یہ اندیشہ لگا رہتا تھا کہ اُلٹ کر گرے تو تہ بند کا کیا حشر ہوگا۔ دوسری طرف دونوں ہاتھوں سے جسم کی چادر کو دباتے کہ کہیں کُھل نہ جائے اور بدن برہنہ نہ ہو جائے۔

گدھوں کی ہنگامہ خیزی:

پروفیسر عبدالحی عرب کا گدھا بالخاصہ ہنگامہ خیز تھا۔ جہاں اونٹوں کا ہجوم اور ہنگامہ زیادہ ہوتا تھا اور مرور کی جگہ کم ہوتی، اکثر و بیشتر اُدھر ہی کا رُخ کرتا اور پروفیسر صاحب انتہائی سادگی کے ساتھ فرماتے "اوترا بلا" (پنجابی میں کسی غیر متوقع فعل کے ظہور پر ضابط آدمی فاعل پر خفگی یا ناپسندیدگی کا اظہار کرتے وقت کہا کرتے ہیں "اُو تیرا بھلا" پروفیسر صاحب عرب ہیں "بھلا" نہیں کہہ سکتے ہیں۔ اس لیے "بلا" بولتے ہیں اور ان کی زبان سے یہ جملہ بے حد دلکش معلوم ہوتا ہے، سنتے ہی بے اختیار ہنسی آجاتی ہے)۔ ایک موقع پر چند مکی اپنے خانگی گدھے دوڑاتے ہوئے ہمارے پاس پہنچ گئے۔ ہمارے گدھوں نے اپنے تازہ دم ہم جنسوں کو ہنگامہ آرائی پر آمادہ پا کر خود بھی ہنگامہ آرائی شروع کر دی۔ کافی دیر تک بھاگ دوڑ رہی اور خدا ہی نے ہمیں گرنے سے محفوظ رکھا۔ ارادہ یہ تھا کہ ظہر اور عصر کی نمازیں ملا کر منیٰ میں پڑھیں گے مگر ہم مغرب کے وقت مسجد خیف میں پہنچے اور ۸ر کو صرف مغرب وعشا کی نمازیں منیٰ میں ادا کر سکے۔

زمین پر آرام:

اب ایک اور مصیبت نازل ہوئی۔ وہ یہ کہ ہم تو مغرب کے وقت منیٰ میں پہنچ گئے، لیکن ہمارا قافلہ ابھی تک گم تھا۔ چوں کہ وہ عصر کے وقت مکہ معظمہ سے روانہ ہوا تھا اس لیے اس کے عشا کے بہت دیر بعد منیٰ میں پہنچنے کی اُمید تھی اور ہمارے پاس جامہ یا احرام کے علاوہ

اگر کچھ تھا تو روپے تھے جو میں نے چمڑے کی ایک تھیلی میں بند کر رکھے تھے اور تھیلی حمائل کے طور پر میرے گلے میں پڑی ہوئی تھی۔ نماز سے فارغ ہو کر میں، اسمٰعیل اور خواجہ غلام محمد بازار میں آئے۔ وہاں ایک ہوٹل میں کھانا کھایا۔ پروفیسر صاحب اور سیٹھ عبدالشکور کے لیے کھانے کا انتظام کیا۔ ہوٹل کے آدمی کو ساتھ لیا اور مسجد میں پہنچ گئے۔ کھانے سے فارغ ہوئے تو نیند آنے لگی تو مسجد ہی میں پڑے رہنا مناسب سمجھا۔ چنانچہ ہمارے سامان میں سے دو بڑی دریاں خان صاحب نے ہمارے لیے مسجد میں بھیج دیں اور ہم نے ان پر شب بھر آرام کیا۔ لیکن رات کے نصف آخر میں سخت سردی ہوگئی۔ چار بجے کے قریب ہم سب سردی کی شدت کے باعث جاگ رہے تھے۔ اس وقت وضو کیا، نماز پڑھی اور پھر اپنے ڈیرے کی طرف نکل پڑے۔

عرفات کی طرف روانگی:

ہم اپنے ڈیرے پر پہنچے تو خان صاحب نماز سے فارغ ہو کر چاے کا انتظار کر رہے تھے۔ ڈپٹی صاحب ان کے پاس بیٹھے تھے۔ ہمیں مکہ معظمہ سے منیٰ تک کے سفر میں ۸/ تاریخ کو گدھوں پر اتنا آرام ملا تھا کہ ہم نے رات ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ جس طرح ہماری سواری کے لیے اونٹ مکہ معظمہ سے منیٰ تک خالی آئے تھے، اسی طرح منیٰ سے عرفات تک خالی جائیں گے اور گدھوں پر سوار ہو کر چلیں گے۔ خان صاحب نے ہر چند کہا کہ چاے پی کر چلنا لیکن ہم نے ان سے اجازت لی۔ آبادی سے دور باہر نکل کر ایک قہوہ خانے میں چاے پی اور وہیں سے گدھوں کا انتظام کر لیا۔ اسمٰعیل اور سیٹھ عبدالشکور سانڈنیوں پر عرفات جانے کا فیصلہ کر چکے تھے، وہ سانڈنیوں پر سوار ہو گئے اور ہم نے پھر گدھوں پر ہی قناعت کرنا مناسب سمجھا۔ میں نے اسمٰعیل سے اور سیٹھ صاحب سے ہر چند کہا کہ خدا کے لیے اس مصیبت سے بچیے۔ سانڈنی کی سواری خواہ وہ چار ہی میل کے لیے ہو، جسم کا کچومر نکال دے گی نیز جاے نشست کو مجروح کر کے رکھ دے گی، مگر ہمارے بھائی خدا معلوم کیوں ہوا کے گھوڑے پر سوار تھے کہ انھوں نے ہماری مخلصانہ استدعاؤں کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔ ہم بدستور

سابق گدھوں پر سوار ہوئے۔ دو گدھوں کا کرایہ دو ریال فی راس، اور دو کا ڈیڑھ ریال فی راس تھا، دس بجے کے قریب ہم مسجد نمرہ کے پاس پہنچ گئے۔ وہاں سے ہمارے خیمے تقریباً ایک میل دور تھے۔ ہم خیموں کی طرف جانے لگے تو مسجد نمرہ کے قریب ایک قہوہ خانے سے کسی نے آواز دی۔ دیکھا کہ اسمٰعیل اور سیٹھ شکور لیٹے ہوئے ہیں اور اگرچہ شرمندگی کے باعث اپنا دکھ بیان نہیں کرتے مگر نشست و برخاست کے انداز سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ سانڈنیوں کی سواری نے ان کے ساتھ خوش گوار سلوک نہیں کیا۔ ہم بھی قہوہ خانے میں بیٹھ گئے، پانی پیا، چائے پی، بعد ازاں خواجہ غلام محمد اور چراغ دین پہلوان کو اپنے خیموں میں بھیجا کہ وہ انناس کے کچھ ڈبے اور کھانے کی چیزیں لے آئیں۔ ہم ایک گھنٹے تک ان کا انتظار کرتے رہے، مگر وہ نہ آئے لاچار قہوہ خانے سے کچھ روٹی لے کر کھانے کا فیصلہ کیا

عرب کا بھُنا ہوا گوشت:

پروفیسر صاحب نے تجویز پیش کی کہ گوشت بھنوایا جائے۔ میں نے اس خیال سے اس تجویز کی تائید کی کہ بہرحال بھنا ہوا گوشت مزے دار ہوگا لیکن ؎

خود غلط بود آں چہ ما پنداشتیم

قہوچی نے گوشت کا ایک عمدہ ٹکڑا خریدا۔ میں دل میں بڑا خوش ہوا کہ عرفات میں مزے دار کھانا ملے گا لیکن پندرہ منٹ بعد وہ دل کش ٹکڑا چھوٹی چھوٹی سیاہی مائل بوٹیوں کی صورت میں ہمارے دسترخوان پر آیا تو ساری خوشی پسینہ بن کر بہ نکلی۔ اس میں سے ایسی بُو آ رہی تھی کی میرے لیے دستر خوان پر بیٹھنا مشکل ہو گیا۔ اگر بو نہ بھی آتی تو میرے خیال میں کراہتِ منظر ہی بھوک کا خاتمہ کر دینے کے لیے کافی تھی۔ گھی اور مصالحہ تو رہا ایک طرف اس میں نمک مرچ تک مفقود تھے۔ عربوں کا دستور یہ ہے کہ گوشت کی بوٹیاں بنا کر انھیں اُلٹے توے پر ڈال دیتے ہیں اور چند منٹ تک ہلا ہلا کر رکابی میں اُلٹ دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک اس کا نام ہے "بھنا ہوا گوشت" پروفیسر صاحب عرب ہیں، وہ بوٹی اٹھاتے اور منہ میں ڈال کر کہتے "واللہ بڑا مزے دار ہے" میں پہلے ہی غصے میں بھرا ہوا تھا۔ پروفیسر

صاحب کے یہ کلمات غصے کی آگ پر تیل کا کام دے رہے تھے۔ جس بڑی رکابی میں یہ بھنا ہوا گوشت پڑا تھا اس کے ایک جانب ایک مشت بحری نمک رکھا ہوا تھا۔ پنجاب کے باشندے نہیں سمجھ سکتے کہ بحری نمک کیا ہوتا ہے؟ وہ نمک جو سمندر کے پانی سے بنتا ہے اور جسے بنانے کے لیے گاندھی جی نے پچھلے دنوں خلاف ورزی قانون کی تحریک شروع کی تھی، نمک کی چھوٹی چھوٹی میلی کچیلی ڈلیاں، جو کبھی کونڈی ڈنڈے یا ہاون دستے کی منت کش تھیں۔ اس لیے کہ ان پر پسینے کا عمل جاری کرنے کا کسی کو خیال بھی نہیں آسکتا۔ پروفیسر صاحب چند ڈلیاں اٹھا کر اپنے سامنے کی بوٹیوں پر ڈال لیتے اور مزے لے لے کر کھاتے۔ اسماعیل نے خدا معلوم کس وجہ سے ان کا ساتھ دینے کی ہمت کی۔ لیکن دو منٹ میں اُس کی ہمت بھی کافور ہوگئی۔ سیٹھ عبدالشکور صاحب نے زیادہ دیر تک پروفیسر صاحب کا ہاتھ بٹایا۔ بارہ بجے کے قریب چراغ دین صاحب آئے۔ اناس کے چند ڈبے اور کچھ بسکٹ لائے۔ ان چیزوں کو کھا کر ہم نے اللہ کا شکر ادا کیا اور نماز کے لیے مسجد میں جانے کی تیاریاں کرنے لگے۔

پہلا قتال جہاد:

سلطان نے اگرچہ تھوڑی دیر کے لیے موٹروں کی اجازت دی تھی لیکن ہمیں معلوم ہوا کہ اکثر نوکروں چاکروں نے اجازت سے فائدہ اٹھا کر متعدد چکر لگائے اور ان کی وجہ سے اونٹوں والے مسافروں کو بے حد تکلیف ہوئی۔ خود سلطان ابن سعود اور امیر فیصل منیٰ سے عرفات اونٹوں پر آئے۔ ساڑھے بارہ بجے کے قریب ہم وضو کر کے مسجد میں پہنچے تو اس وقت تک مسجد کا مسقف حصہ نمازیوں سے لبریز ہو چکا تھا۔ صحن میں جو حصہ ہے وہ بھی بھرا ہوا تھا۔ غیر مسقف صحن کے ایک حصے میں نمازی تھے۔ ہمیں دھوپ میں جگہ ملی لیکن خدا کا شکر ادا کر کے وہیں کھڑے ہو گئے۔ تھوڑی دیر میں حافظ محمد صدیق صاحب اور ان کے رفقا مل گئے۔ حضرت عبید اللہ (سندھی) آگئے۔ ہم قہوہ خانے سے ایک بوریا اُٹھوا لائے تھے، اسے بچھایا اور چھتریاں کھول کر اس پر بیٹھ گئے۔ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ سلطان المعظم ایک گھنٹے

میں نماز کے لیے آئیں گے، اور جماعت ڈیڑھ بجے کھڑی ہوگی۔ ہم ایک گھنٹہ وہیں دھوپ میں بیٹھے رہے اور حضرت مولانا عبید اللہ سے حقائق و معارف حج سمجھتے رہے۔ حضرت مولانا نے فرمایا کی حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی نے اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں ایک عجیب وغریب جملہ لکھ دیا ہے جو حقائق ومعارفِ حج کا منبع ہے۔ یعنی حج جہاد ہے لیکن اس میں قتال نہیں ہوتا۔ یہ جملہ سنتے ہی اسماعیل تڑپ اٹھا اور کہنے لگا۔ ہم نے کئی مرتبہ حجۃ پڑھی ہے اور ہماری طرح سیکڑوں نے پڑھی ہوگی، مگر اس جملے کی حقیقت آج تک معلوم نہ ہوئی اور اب کچھ بیان کرنے کی حاجت نہیں، سارے معارف سمجھ میں آ گئے، لیکن حضرت مولانا نے ہم لوگوں کی تسکین وتسلی کے لیے مفصل لیکچر دیا اور بتایا کی حج کی غرض کیا تھی اور کس طرح آج کل یہ غرض فوت ہو چکی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ عرفات کے اجتماع کا حقیقی مقصد یہ تھا کی اُمت کے تمام سپاہی ایک وردی پہن کر آئیں۔ عسکریت کی زبان میں اس اجتماع کی نسبت یہ کہا جائے گا کہ گویا سپاہی پہنچ کر اپنا نام درج کرا رہے ہیں۔ اس کے بعد منزل بہ منزل کوچ ہوتا ہے مثلاً عرفات سے مزدلفہ، مزدلفہ سے منیٰ۔ چونکہ فوج بہت بڑی ہو جاتی ہے اس لیے منزل کم کر رکھی ہے۔ یعنی عرفات سے مزدلفہ چار میل، مزدلفہ سے منیٰ تین ساڑھے تین میل۔ منیٰ پہنچ کر قربانی کی جاتی ہے۔ جس کی غرض یہ ہے کی اُمت کا ہر سپاہی سمجھ لے کہ اسے کیا کرنا ہے۔ جس طرح وہ قربانی کے جانور کا خون بہاتا ہے اسی طرح اسے اپنا خون خدا کی راہ میں بہانے کے لیے تیار ہو جانا چاہیے۔ اس سلسلے میں حضرت مولانا نے سورۂ کوثر کی تفسیر بھی بیان فرمائی جسے تفصیل کے ساتھ میں الگ لکھوں گا۔

(انقلاب: ۶ر جولائی ۱۹۳۰ء ص ۴،۵)

سُلطان المعظم بہ حالت احرام:

حضرت مولانا عبید اللہ حج کے حقائق و معارف بیان فرماتے رہے اور ہمیں اس اثنا میں دھوپ کا خیال تک نہ ہوا، تا آنکہ لوگوں نے اٹھ اٹھ کر مسجد کے دروازے کی طرف دیکھا تو سلطان المعظم بہ حالتِ احرام مسجد میں داخل ہو چکے تھے۔ کمر میں سفید چادر تھی،

بدن پر ہلکے زعفرانی رنگ کی مہین چادر تھی، سر ننگا تھا، گردن جھکی ہوئی تھی۔ پاؤں میں چپلی تھی۔ ارد گرد سپاہی تھے اور خراماں خراماں آ رہے تھے۔ پیچھے امیر سعود اسی حالت میں تھے۔ میرے لیے جلیل القدر والئ ملک کو احرام کے لباس میں دیکھنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ اسمٰعیل اب تک حضرت سلطان المعظم سے نہیں مل سکا تھا اس لیے کہ دعوت کے روز اس کی طبیعت ناساز ہو گئی تھی۔ بعد کے دو دنوں میں سلطان کو بالکل فرصت نہیں مل سکی تھی۔ سلطان ہماری صف کے قریب پہنچے تو اسمٰعیل نے آگے بڑھ کر مصافحہ کیا۔ سلطان المعظم کھڑے ہو گئے۔ مزاج پوچھا کہا کہ تم چار روز سے آئے ہوئے ہو، ملے کیوں نہیں؟ میں نے کئی مرتبہ تمھارے متعلق پوچھا۔ اسمٰعیل نے عرض کیا کہ پہلے طبیعت ناساز رہی پھر حضرت کی مصروفیت مانع رہی۔ سلطان دو منٹ تک کھڑے رہے اور اسمٰعیل سے باتیں کرتے رہے۔ بعد ازاں اسمٰعیل کو ساتھ لے کر مسجد کے مسقف حصے میں چلے گئے ان کے اندر پہنچتے ہی جماعت کھڑی ہو گئی۔ پہلے ظہر کی نماز ہوئی اس کے ساتھ ہی عصر کی نماز ہوئی۔ شیخ عبداللہ بن حسن قاضی القضاۃ نے خطبۂ حج پڑھا جس میں اعمالِ حج بیان کیے۔ بعد ازاں سلطان المعظم اور امیر سعود اپنے خیموں میں چلے گئے اور عام حاجی بھی مسجد سے باہر نکل گئے۔ ہم نے وہاں سے اپنے خیمے کا رخ کیا لیکن راستے میں منشی احسان اللہ خان کا خیمہ تھا اور منشی صاحب نے ہمیں بہ اصرار روک لیا۔ اس دوران کھانا آیا اور ہم سب نے کھانا وہیں کھایا۔ ایک پنجابی نے حقہ پلایا۔ ایک گھنٹے تک ہم منشی صاحب کے پاس بیٹھے رہے پھر اپنے خیمے سے ہوتے ہوئے دعا کے لیے جبلِ رحمت کی طرف روانہ ہو گئے اور خان صاحب سے کہہ گئے کہ مزدلفہ میں ملیں گے۔

وقوف عرفات اور نجدی:

مجھے وادی عرفات میں جو چیز بہت تکلیف دہ معلوم ہوئی، یہ تھی کہ حاجی بغیر کسی ترتیب کے خیمے لگا لیتے ہیں نہ ان کے درمیان کوئی گنجایش باقی رہتی ہے اور نہ کوئی شخص بھول کر دوبارہ اپنے خیمے میں پہنچنے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ کئی آدمی ہمیں منشی صاحب کے خیمے میں

نظر آئے جو بے چارے اپنے خیمے بھول چکے تھے۔ منشی صاحب نے ان کو کھانا کھلایا۔ ان کا ارادہ تھا کہ آئندہ سال ان شاء اللہ بھولے بھٹکوں کے لیے ایک مستقل خیمے اور کھانے کا انتظام کر دیں گے۔ ہم چار بجے جبلِ رحمت پہنچے لیکن وہاں بیٹھنے کی کوئی جگہ نظر نہیں آتی تھی۔ اول تو اس پر آدمیوں کا ہجوم تھا، دوسرے ایک رات قبل آئے ہوئے حاجیوں نے وہیں رفع حوائج کر کر کے اسے گندہ کر دیا تھا۔ پہلے ہم ایک مقام پر ٹھہرے اور دعائیں مانگتے رہے پھر میں اُوپر چڑھ کر نجدیوں کے وقوف کی شان دیکھتا رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ وقوف کا حق صرف نجدی ادا کرتے ہیں۔ وہ نماز سے فارغ ہوتے ہی سانڈنیوں پر سوار ہو کر جبلِ رحمت کے پاس پہنچ جاتے ہیں اور دو بجے سے لے کر غروب آفتاب تک ملے جلے بغیر دعائیں مانگتے یا قرآن پڑھتے رہتے ہیں۔ اس منظر کو دیکھ کر میرے دل پر بڑا اثر ہوا۔ ہندوستانیوں، مصریوں، حجازیوں اور دوسرے حاجیوں کی یہ حالت ہے کی ان میں سے اکثر تو مسجد تک بھی نہیں جاتے۔ منیٰ سے عرفات آ کر اپنے خیموں میں بیٹھ جاتے ہیں۔ اور غروب آفتاب تک وہیں بیٹھے رہتے ہیں۔ باہر نکلنے کا نام نہیں لیتے۔ میں پھر پھرا کر سارے حالات دیکھ چکا تو ہم سب پہاڑی پر سے اتر کر اُس کے پائیں میں آگئے جہاں تھوڑی سی صاف جگہ مل گئی، وہاں بیٹھ کر ہم نے دعائیں شروع کیں۔ غروب آفتاب سے تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ قبل ہم کھڑے ہو گئے۔ اسماعیل بلند آواز سے دعا مانگتا جاتا اور ہم آمین آمین کہتے جاتے۔ رو رو کر مسلمانوں کی عزت و برتری کے لیے، سلاطین واکابر اسلام کی عزت و برتری کے لیے، تمام مسلمانوں کی آزادی کے لیے اور ہندوستان کی آزادی کے لیے پر تاثیر دعائیں مانگیں۔ آفتاب غروب ہونے لگا تو ہم وہاں سے اُٹھ کر آہستہ آہستہ مسجد نمرہ کے پاس والے قہوہ خانے میں آگئے۔ اس وقت کا منظر بڑا عجیب تھا جب ہم عرفات کی طرف جا رہے تھے تو ہر سمت سے لبیک اللھم لبیک لا شریک لک لبیک کی صدائیں بلند تھیں۔ اب واپسی کا وقت آیا تو لبیک اللھم لبیک کے ساتھ مختلف پارٹیاں اللہ اکبر اللہ اکبر لا الٰہ إلا اللہ واللہ اکبر اللہ اکبر وللہ الحمد کا ذکر بھی کر رہی تھیں۔

حاجیوں کی تعداد:

اس سال سمندر کے راستے ۸۲ ہزار حاجی آئے تھے۔ نجدیوں کی تعداد پچاس ہزار سے کم نہ ہوگی۔ یمن، حجاز، شام اور سوڈان سے جو حاجی آئے وہ بیاسی ہزار حاجیوں کے علاوہ ہیں، ان کی تعداد بھی کم وبیش پچاس ہزار ہوگی۔ باقی ایک لاکھ سے زائد اب کے مکہ اور پچیس ہزار کے قریب حوالیٔ مکہ کے بدو اور شتربان وغیرہ۔ اس طرح عرفات کا اجتماع تین لاکھ اور چار لاکھ کے درمیان تھا۔ ان لوگوں کا گروہ گروہ ہوکر روانہ ہونا اور یک زبان ہوکر ذکر کرنا عجب سماں پیدا کر رہا تھا۔ سلطان المعظم اونٹوں پر آئے تھے اور اونٹوں پر ہی واپس گئے۔

عرفات سے واپسی:

ہم قہوہ خانے میں پہنچے تو سب سے پہلے چائے پی، پھر کھانے کا انتظام کرنے لگے۔ ہم لیٹ گئے چراغ دین پلاؤ پکاتا رہا۔ ایک گھنٹہ میں وہ پلاؤ پکا کر لے آیا لیکن مجھے بالکل بے مزہ معلوم ہوا۔ چراغ دین بے چارہ کیا کرتا۔ نہ مرچ تھی نہ مصالحہ، تھا تو صرف بحری نمک تھا۔ بہر حال ہم نے تھوڑا تھوڑا کھایا اور چاے پی کر چلنے لگے۔ چاندنی رات، کھلا میدان، دل پسند خنکی۔ جی چاہتا تھا کہ پیدل چلیں اور دل میں خیال تھا کہ مزدلفہ قریب ہی ہے۔ ایک جگہ گدھے ملے۔ پروفیسر صاحب نے کرایے کا فیصلہ کیا مگر میں نے کہا کہ کرایہ زیادہ ہے اور میں تیز قدمی سے آگے چلنے لگا۔ اسمٰعیل، سیٹھ عبدالشکور اور پروفیسر صاحب نے بھی میری تجویز کی مخالفت نہ کی۔ لیکن جب پندرہ منٹ چلتے ہوئے گزر گئے تو قدرِ عافیت معلوم ہونے لگی۔ میں تھک کر ایک جگہ ریت پر بیٹھ گیا۔ پھر اُٹھا تھوڑی دور پہنچ کر ٹانگوں نے بالکل جواب دے دیا لیکن میرے ساتھی خاموش چل رہے تھے۔ انھیں دیکھ کر مجھے شرم آئی تو پھر اُٹھ کر پیدل چلنے لگا تھوڑی دور چل کر پھر بیٹھنے پر مجبور ہوگیا۔ غرض اسی طرح اُٹھتے بیٹھتے یہ سفر طے ہوا۔ کرایے پر اونٹ اور گدھے چلانے والوں کی آوازیں ہر دس بیس قدم پر ہمارا استقبال کرتیں۔ پانچ دس منٹ کے بعد ''یارویکب یارویکب'' کی صدا آتی۔ ہمارے پروفیسر صاحب دل لگی کے طور پر خود بھی یارویکب یارویکب کہنے لگے مگر میں تنہا

سواری کرنے پر آمادہ نہ ہوا اور دوسرے سواری کے چنداں خواہاں نظر نہ آتے تھے۔ شاید وہ مجھے ستانا چاہتے تھے۔ رات کے بارہ بجے کے قریب مزدلفہ پہنچے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہمیں اپنے قافلے کی تلاش میں زیادہ وقت نہ صرف کرنا پڑا اور مسجد کے قریب پہنچتے ہی پتہ مل گیا۔ ایک بڑی دری لی، بچھائی اور لیٹ گئے۔ تھک کر چور ہو چکے تھے اس لیے نیند جلد آ گئی لیکن رات کے آخری حصے میں سردی پھر بہت بڑھ گئی۔ اس لیے تڑکے بیدار ہو گئے۔ وضو کیا، نماز پڑھی، دعائیں مانگیں۔ طلوع آفتاب کے قریب گدھوں پر سوار ہو کر ایک گھنٹے کے اندر اندر منیٰ پہنچ گئے۔

رمی جمرۂ اولیٰ:

سب سے پہلے ہم شیخ عبدالرحمٰن مظہر کے مقام پر گئے۔ وہاں ڈپٹی عبدالحمید صاحب ملے۔ ڈپٹی صاحب نے مکہ معظمہ سے عرفات سے منیٰ تک سارا سفر پیدل طے کیا تھا۔ ان کے رفیق خان بہادر عبدالحکیم خاں ریٹائرڈ سپرنٹنڈنٹ پولیس تھے۔ ڈپٹی عبدالحمید حج سے فارغ ہو کر یورپ جا رہے تھے اس لیے وہ چاہتے تھے کی کسی طرح انھیں کسی مصری جہاز میں بیٹھ کر اسکندریہ پورٹ سعید جانے کا موقع مل جاتا۔ اس سلسلے میں دو مصیبتیں تھیں۔ اوّل یہ کہ حج سے فارغ ہو کر جانے والوں کو طورین یا کسی دوسرے مقام پر قرنطینہ میں ٹھہرنا پڑتا تھا، دوسرے اس بات کا اندیشہ تھا کہ حج کے بعد جلد کسی غیر مصری کو مصر کی طرف جانے والے جہاز پر نہیں بیٹھنے دیں گے۔ ہم نے ڈپٹی صاحب کے ساتھ وعدہ کر رکھا تھا کہ منشی احسان اللہ خاں صاحب سے مل کر ان کی مشکلات کو رفع کرانے کی مناسب کوشش کریں گے۔ چنانچہ مظہر صاحب کے مقام سے ڈپٹی صاحب کو ساتھ لے کر پہلے ہم نے بڑے شیطان کے کنکریاں ماریں، اس کے بعد منشی صاحب کے مکان پر چلے گئے جو بڑے شیطان سے بہت قریب تھا۔ وہاں پہنچ کر ڈپٹی صاحب کا قصہ بیان کیا۔ اتنے میں منشی صاحب نے ہمارے لیے چھاچھ منگالی۔ پھر کھانا آ گیا۔ ہم نے ہر چند کہا کہ اب خیمے میں جا کر احرام اتارنے دیجیے۔ کہنے لگے کہ حجام موجود ہے، بال کٹواؤ،

نہاو، کھانا کھاؤ ،آرام کرو ، کپڑے شام کو جا کر بدل لینا۔ چنانچہ ہم نے قربانیوں کے روپے خواجہ غلام محمد کے حوالے کیے اور کہا کہ جا کر دُنبے خریدو اور ذبح کراؤ اور خود نہا دھو کر منشی صاحب کے مکان میں لیٹ گئے۔

سُلطان اور خیالِ آسایشِ حجاج:

بازار میں موٹریں تیزی کے ساتھ گزر رہی تھیں جن سے رمی کے لیے آنے جانے والے حاجیوں کو بہت تکلیف ہوتی تھی لیکن کوئی موٹروں والوں کو روکنے پر قادر نہ تھا۔ اس دوران سلطان المعظم کی سواری آئی۔ سلطان رمی سے فارغ ہو کر طواف کے لیے مکہ معظمہ چلے گئے تھے۔ واپسی پر انھیں حاجیوں کی اس تکلیف کی خبر لگی جو غلام بچوں کی سیارہ روائی (سیارہ یعنی موٹر) سے حاجیوں کو پہنچتی تھی۔ جاتے ہی نجدیوں کا پہرہ منیٰ میں مقرر ہو گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ سلطان نے خود موٹر سے اُتر کر اکثر غلام بچوں کو مارا۔ جنھوں نے حاجیوں کی تکلیف سے بے پروا ہو کر موٹریں چلائی تھیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ سلطان گھوڑے پر سوار ہو کر رمی کے لیے آئے تھے۔ شام کو ہم منشی صاحب کے مکان سے اُٹھ کر اپنے خیمے میں گئے اور احرام کے کپڑے اتار کر عام کپڑے پہنے اور مسجد خیف میں نماز ادا کرنے کے لیے آئے تو بازار میں نجدیوں کا پہرہ تھا۔ ہمارے سامنے یکے بعد دیگرے چھ موٹریں آگئیں جن میں سے ایک سلطان کے بھائی امیر محمد کی تھی، دوسری شیخ عبداللہ علی رضا گورنر جدہ کی ،تیسری قصیبی خاندان کی۔ باقی موٹروں میں بعض اکابر جدہ تھے۔ نجدیوں نے تمام موٹروں کو آبادی منیٰ کی آخری حد پر روک دیا۔ سب سوار اُتر کر پیدل واپس چلے گئے اور موٹریں شفاخانہ منیٰ کے صحن میں کھڑی کر دی گئیں۔ اس کے بعد تین روز تک منیٰ کے اندر کوئی موٹر نہ چلی۔

چند سرکش نجدی:

ہم منشی صاحب کے مکان پر بیٹھے تھے، سامنے کے مکان میں چند نجدی غلام تھے۔ ایک وقت ہماری نگاہ اس کے دو بچوں پر پڑی تو کیا دیکھتے ہیں کہ چند لوگ تربوز کھا کر چھلکے بازار

میں چلنے والے حاجیوں پر مارتے ہیں۔ پروفیسر صاحب اس منظر کی تاب نہ لاسکے اور چھلکے مارنے والوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگے کہ تمھیں شرم نہیں آتی جو یوں حاجیوں کو تنگ کرتے ہو۔ میں جلالۃ الملک کے پاس جاؤں گا اور تمھاری شکایت کروں گا۔ نجدی غلاموں نے پروفیسر صاحب کی ڈانٹ پر کوئی توجہ نہ دی۔ اس کے بعد اگرچہ چھلکے پھینکنے کا سلسلہ رُک گیا۔ مگر ہمیں بڑا رنج ہوا کہ نجدی غلاموں نے حاجیوں کو تنگ کرنے کی کیوں کر جرأت کی!

ہم نے فیصلہ کرلیا کہ سلطان سے ملیں گے تو ضرور اس واقعے کا ذکر یں گے۔ دوسرے روز صبح کو ہمیں عید کے سلام کے لیے سلطان کے پاس جانا تھا۔ پروفیسر صاحب چھلکوں کے واقعہ سے بہت مضطرب تھے۔ سوچنے سمجھنے کے بعد مناسب یہ معلوم ہوا کہ سارا واقعہ لکھ کر سلطان کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ چنانچہ پروفیسر صاحب نے مختصراً واقعہ کی کیفیت لکھی، اسے لفافے میں بند کیا ہم رخصتی سلام کے بعد باہر نکلنے لگے تو پروفیسر صاحب نے ملفوف عریضہ پیش کر دیا۔ ہم سلطان کے دربار سے نکل کر امیر محمد کے خیمے میں چلے گئے، جو پاس ہی نصب تھا۔ ابھی وہاں بیٹھے ہی تھے کہ سلطان کا آدمی آکر پروفیسر صاحب کو ساتھ لے گیا اور کہنے لگا کہ وہ مکان دکھا دیجیے جس میں سے چھلکے مارے گئے تھے۔

پروفیسر صاحب نے مکان دکھا دیا۔ پولیس کے آدمی مکان کے تمام نجدیوں کو پکڑ کر سلطان کے روبرو لے گئے۔ اب نجدیوں کو اپنی ناواجب حرکت کا انجام نظر آنے لگا۔ کہنے لگے ہمیں خدا کے واسطے معاف کر دیا جائے ہم سے غلطی ہوگئی۔ خطا ہوگئی۔ سلطان نے کہا میں خدا ہی کے لیے تمھیں سزا دوں گا تاکہ تمھیں آیندہ ایسی حرکت کرنے کی جرأت نہ ہو۔ چناں چہ انھیں عبرت ناک سزا دی گئی۔

سُلطان اور شہزادوں سے ملاقاتیں:

ہم ۱۱رذی الحجہ کو صبح کے دس بجے سلطان کی بارگاہ میں عید کے سلام کے لیے حاضر ہوئے۔ سلطان اپنے محل کے باہر ایک بڑے خیمے میں تشریف فرما تھے اور دونوں بازوؤں پر کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ سامنے بھی کرسیوں کی قطاریں تھیں۔ ہم سے پہلے کئی آدمی بیٹھے

تھے۔ سلطان کے پیچھے بعض اکابر ارکانِ حکومت تھے اور خود سلطان ایک مصری سے نجدی باغیوں کے متعلق باتیں کر رہے تھے کہ ہم نے ان پر کبھی ظلم نہیں کیا تھا۔ کبھی یہ حالت نہیں ہوئی تھی کہ ہمارے پیٹ بھرے ہوئے ہوں اور وہ بھوکے ہوں۔ ہمارا کھانا ان کا کھانا تھا۔ ہماری چیزیں ان کی چیزیں تھیں۔ ہم ان کے بڑوں کو اپنے باپ کے برابر، ان کے چھوٹوں کو اپنے بچوں کے برابر اور ان کے جوانوں کو اپنے بھائیوں کے برابر سمجھتے تھے۔ مگر نہیں معلوم، انھیں شیطان نے کیا پٹی پڑھائی کہ وہ خوں ریزی اور خانہ جنگی کا باعث بنے۔ ہم پہنچے تو سلطان نے ازراہ اخلاق کھڑے ہو کر مصافحہ فرمایا۔ سلطان کے سلام سے فارغ ہو کر ہم امیر سعود کے سلام کے لیے گئے۔ ان کا خیمہ پاس ہی تھا۔ اس خیمے میں بھی کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ جلیل القدر باپ کے جلیل القدر فرزند نے بھی کھڑے ہو کر مصافحہ کیا اور فرمایا کہ الحمد للہ حج کے دنوں میں موسم بڑا اچھا رہا۔ وہاں سے بھی قہوہ پی کر ہم رخصت ہوئے اور امیر فیصل کے خیمے میں چلے گئے جو سلطان اور امیر سعود کے خیموں سے قدرے فاصلے پر تھا۔ امیر فیصل فرش پر بیٹھے تھے اور نجدیوں کے عام قاعدے کے مطابق سانڈنی کی زین تکیے کی جگہ رکھی ہوئی تھی۔ انھوں نے بھی ہم سے کھڑے ہو کر مصافحہ کیا۔ قہوہ پلایا، موسم کی تعریف کی اور تھوڑی دیر میں ہم رخصت ہو کر آگئے۔ اس وقت تک منشی صاحب کے ہاں سے ایک آدمی کھانے کی دعوت لے کر آگیا تھا۔ ہم ان کے مکان پر گئے۔ کھانا کھایا اور شام تک وہیں لیٹے رہے۔

منیٰ سے واپسی:

قیام منیٰ میں مصری اخبار ''الریاض'' کے مدیر سے ملاقات ہوئی۔ ایک مصری فوٹو گرافر اور فلم لینے والے سے ملاقات ہوئی۔ جو امریکہ کی ایک مشہور کمپنی ''پیرامونٹ'' کا ایجنٹ تھا۔ یہ شخص حج کی فلم لینے آیا تھا مگر فلم کا مناسب بندوبست نہ ہو سکا۔

۱۱ کو ہم نے غروب آفتاب سے قبل تینوں شیطانوں کو کنکریاں ماریں۔ رمی کی حقیقت بھی رمی کو دیکھ کر سمجھ میں آتی ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تمام طواغیت باطلہ جمرات میں

سمٹ آئی ہے اور ہر فرزندِ توحید بسم اللہ اللہ اکبر کہہ کر ان کا خاتمہ کر دینا چاہتا ہے۔ ۱۲؍ کو بعد زوال کنکریاں مار کر ہم نے واپسی کی ٹھانی۔

بہت سے لوگ ۱۲؍ کو صبح ہی منیٰ سے چلے آئے تھے۔ ہم تین بجے کے قریب واپس ہوئے۔ جمرہ عقبیٰ کے پاس سے گدھے کرائے پر لیے اور چار بجے کے قریب مکہ معظمہ پہنچ گئے۔ راستے میں پروفیسر صاحب کا ''او تیرا بلا'' اور ''یا رو یکب یا رو یکب'' برابر جاری رہے۔ آتے ہی طواف افاضہ کیا اور مغرب کی نماز پڑھ کر اپنی قیام گاہ پر چلے گئے۔ اس وقت اونٹ ہمارا سامان لے کر پہنچ چکے تھے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے ہمیں حج کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔ ولہ الحمد البدایۃ والنہایۃ۔

متفرق اُمور:

خدا کا شکر ہے کہ حج کے دنوں میں موسم بڑا خوش گوار رہا۔ اس دفعہ عرفات میں یا منیٰ میں کوئی ناگوار واقعہ پیش نہ آیا۔ مکہ سے منیٰ تک راستے پر روشنی کا انتظام تھا۔ مزدلفہ اور عرفات میں بھی روشنی کا انتظام تھا۔ پانی ہر جگہ بکثرت ملتا تھا۔ سارے راستے میں ایک ایک میل کے فاصلے پر حکومت کی طرف سے مظلات یا سائبان لگے ہوئے تھے جن میں ڈاکٹر (کمپونڈر) کچھ ادویہ اور پانی موجود تھا۔

تکرونیوں اور یمنیوں کے متعلق میں نے حج کے دنوں میں یہ عجیب چیز دیکھی کہ یہ لوگ میدان میں نہیں ٹھہرتے بلکہ پہاڑ پر ٹھہرتے ہیں۔ سخت دھوپ کے اوقات میں بھی پہاڑ ہی پر رہتے ہیں۔

اس باب کی ترتیب میں دو تین ضروری باتیں میرے ذہن سے اُتر گئیں۔ اول یہ کہ ہم نے محض ۱۱؍ کو سلطان المعظم سے ملاقات کی اور اسماعیل ۱۲؍ کو بھی ان سے ملنے کے لیے گیا اور تقریباً آدھ گھنٹے تک باتیں ہوتی رہیں۔ دوسرے منشی احسان اللہ خاں کے زیر اہتمام مکہ معظمہ اور منیٰ میں طبی امداد کا بڑا اچھا انتظام تھا۔ ڈاکٹر جدہ چلے آئے یعنی ہمارے نہایت ہی عزیز دوست ڈاکٹر عبدالحمید صاحب۔ دوسرے ڈاکٹر بدستور مکہ معظمہ میں موجود رہے۔ سنا ہے کہ وہ ۱۵؍ محرم تک وہیں رہیں گے۔

منشی احسان اللہ صاحب کا کام:

حاجیوں کی ضروری امداد واعانت کے سلسلے میں منشی احسان اللہ خاں کا کام تعریف و ستائش سے بالا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ہر حاجی اس کی علی الا علان شہادت دے گا۔ یہ امداد محض ان کے مفوضہ فرایض تک محدود نہیں، بلکہ ہمہ گیر ہے۔ ایک روز ہم منشی صاحب کے پاس بیٹھے تھے، کہ دو آدمی روتے ہوئے آئے۔ ایک کے پاس پانچ سو کی ہنڈی تھی اور دوسرے کے پاس چار سو کی ہنڈی۔ ان لوگوں نے روپیہ سیٹھ چاند بھائی عمر بھائی کے پاس جمع کرا کے ہنڈیاں لے لی تھیں مگر جس شخص یا جن اشخاص کے نام ہنڈیاں لے لیں تھیں، وہ پندرہ روز تک ٹال مٹول کرتے رہے۔ یہ لوگ منشی صاحب کے پاس آئے تو منشی صاحب نے فرمایا کہ جن اشخاص کے نام ہنڈیاں ہیں اگر وہ روپے دینے سے انکار کریں تو ان سے لکھوا لاؤ۔ چنانچہ وہ لکھوا لائے۔ ہم نے خود ہنڈیوں کی پشت پر عدم قبول کی تحریر دیکھی۔ یہ سخت پریشان تھے۔ منشی صاحب نے اپنی ذمہ داری پر ان کا کسی دوسری جگہ انتظام کر دیا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اس سے قبل ایک آدمی دو سو کی ہنڈی لیے پھرتا تھا جو مکہ معظمہ میں نا قبول ہو چکی تھی۔ اُس کے پاس عرفات جانے کے لیے بھی خرچ نہیں تھا۔ روانگی کا وقت سر پر آچکا تھا۔ ہر طرف سے مایوس ہو کر منشی صاحب کے پاس آکر رونے لگا۔ منشی صاحب نے اسے اپنی گرہ سے پندرہ پونڈ دے دیے اور کہا کہ باقی روپوں کا انتظام عرفات سے واپسی پر کرا دوں گا۔ ضروری ہے کہ ہنڈیاں دینے والے اصحاب اچھے معتمد علیہ آدمیوں کو ہنڈیوں کے لیے منتخب کریں اور حاجیوں سے روپیہ وصول کر کے نادہند لوگوں کے نام ہنڈیاں نہ دیں۔

(انقلاب: ۸/ جولائی ۱۹۳۰ء ص ۲،۳)

باب ہفتم

ادائے فریضہ حج کے بعد

ہم ۱۲ر کی شام کو منیٰ سے مکہ معظمہ پہنچے۔ ۱۳ر کو اطلاع ملی کہ دو روز کے اندر اندر مدینہ جانے والوں کو اجازت مل جائے گی اور جدہ جانے والوں کو بعد میں اجازت ملے گی۔ منیٰ سے آنے کے بعد دو روز کے اندر اندر گرمی اس قدر تیز ہو گئی تھی کہ ہم جیسے اکثر تنگ حوصلہ ہائے وائے کرنے لگے۔ اسماعیل اس مرتبہ مدینہ منورہ جانے کے لیے تیار نہ تھا۔ لہٰذا ڈپٹی محمد شریف صاحب نے بھی فیصلہ کر لیا کہ وہ مدینہ منورہ نہیں جائیں گے اس لیے کہ عام لوگوں سے سُن چکے تھے کہ راستہ سخت تکلیف دہ ہے۔ گرمی زیادہ ہے اور موٹر کے دھچکوں سے کچومر نکل جاتا ہے۔ سردار گل محمد خاں صاحب سابق سفیر افغانستان بھی اس سال حج کے لیے آئے ہوئے تھے۔ سردار صاحب حج سے قبل مدینہ منورہ کی زیارت کر چکے تھے۔ ہم سے روز ملتے تھے۔ ڈپٹی صاحب نے فیصلہ کیا کہ ان کے ساتھ واپس چلے جائیں۔ سردار صاحب نے سلطان کے حالات دریافت کیے اور بعد میں فرمایا کہ میرے جذبات کی حالت تو یہ ہے کہ میں اعلیٰ حضرت نادر شاہ غازی کے جھنڈے تلے ایک عام لشکری کی حیثیت سے اسلام کے لیے لڑنا باعث فخر سمجھتا ہوں۔ بعد ازاں اعلیٰ حضرت نادر شاہ غازی کے نام ایک مکتوب دیا۔ سردار صاحب کے جدہ تشریف لے جانے کے لیے اپنی موٹر بھیجی۔ سردار صاحب کے ساتھ ہی ڈپٹی صاحب بھی جدہ پہنچ گئے۔ اسماعیل سلطان المعظم کی طرف سے سردار صاحب کو چھوڑنے کے لیے جدہ تک ساتھ آیا۔

سیٹوں کا انتظام:

فیصلہ یہ تھا کہ سلطان المعظم سے دو ایک ضروری ملاقاتیں کر کے مدینہ منورہ جاؤں اور واپسی میں جدہ پہنچ کر جہاز پر سوار ہو جاؤں۔ منشی احسان اللہ خاں صاحب سے جہاز میں سیٹ کے انتظام کے لیے کہا تو انھوں نے صاف انکار کر دیا۔ کہنے لگے کہ تم میرے بھائی ہو، عزیز ہو، دوست ہو، مگر میں اپنے فرایض و واجبات میں کسی تعلق کی پروا نہیں کرتا۔ مقررہ قاعدہ یہ ہے کہ جو شخص جدہ پہنچ کر نام نوٹ کرائے، اس کے لیے سیٹ کا انتظام کیا جائے۔ میں جدہ سے تمھارے لیے اپنی موٹر بھیج دوں گا، اس میں بیٹھ کر جدہ آ جانا۔ لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ جدہ پہنچ کر نام نوٹ کرائے بغیر تمھارے لیے سیٹ کا انتظام ہو سکے اور جو لوگ جدہ پہنچ کر نام نوٹ کرا چکے ہیں ان پر تمھیں ترجیح دی جا سکے۔ ناچار میں خاموش ہو گیا، اسماعیل جدہ گیا تو واپسی کے ٹکٹ بھی لیتا گیا۔ معلوم ہوا کہ ٹرنر مارین کے جتنے جہاز جدہ بندرگاہ میں کھڑے ہیں، ان میں سے آخری جہاز ۲۷ مئی سے لے کر ۳۰ مئی تک جائیں گے۔ اسماعیل نے انھیں جہازوں میں سیٹیں ریزرو کرائیں۔

ہندوستان کی اضطراب انگیز سیاسی فضا:

گاندھی جی کی گرفتاری کی خبر ہمیں منیٰ میں مل چکی تھی، نیز کسی نے بتا دیا تھا کہ پشاور میں ہنگامہ ہو گیا ہے، اسماعیل جدّہ سے بہت سی خبریں لایا، یعنی ڈاکٹر عالم، ڈاکٹر ستیہ پال اور مولانا ظفر علی خاں کی گرفتاری، پشاور کے ہنگامے کی تفصیلات، مولانا عبدالقادر قصوری کا بیان، پریس ایکٹ کا بذریعہ آرڈی نینس نفاذ، دوسرے روز ہماری ڈاک آ گئی، جس میں خطوط کے علاوہ اخبار بھی تھے، عبدالرحمٰن کشمیری مہتمم ڈاک خانہ مکہ نے ہمارے پہنچنے کے دوسرے تیسرے ہی دن محبت بھرا سلام کہلا بھیجا تھا اور فون پر پوچھا تھا کہ کب ملو گے۔ ہم نے اسماعیل کے جدہ سے مکہ پہنچنے پر ڈاک کے متعلق فون پر پوچھا تو شیخ عبدالرحمٰن صاحب فرمانے لگے کہ مغرب کی نماز کے بعد ڈاک ملے گی۔ ہم نے مغرب کی نماز حرم میں ادا کی، اس کے بعد میں اور خان محمد خان صاحب ڈاک خانے میں چلے گئے جو حرمِ پاک کے باب

الوداع کے ساتھ ہے۔ ڈاک لی، خط وہیں دیکھے، پھر حرم میں آ کر اخبار پڑھے، آپ کے (سالک صاحب) خط نے مجھے بہت مضطرب کر دیا اور سیاسی حالات کی اضطراب انگیز روکو مدِّ نظر رکھتے ہوئے میں نے فیصلہ کر لیا کہ جدہ سے جلد از جلد ہندوستان پہنچوں! آغاز سفر میں ارادہ یہ تھا کہ بیت المقدس کی زیارت کے بعد مصر سے ہوتا ہوا ہندوستان آؤں گا، مگر ہندوستان کے حالات معلوم ہو جانے کے بعد لمبے سفر کے ارادے خاک میں مل گئے۔

سردار گل محمد خاں

اسماعیل سردار گل محمد خاں صاحب کو حضرت سلطان المعظم کے پاس ملاقات کے لیے لے گیا تھا، تو اس نے اپنے لیے بھی اجازت طلب کی۔ حضرت سلطان المعظم نے ارشاد فرمایا کہ تمھیں ایسی باتیں زبان پر نہیں لانی چاہییں، میرے متعلق اسماعیل نے عرض کیا کہ بہت گھبرا گیا ہے، ارشاد ہوا کہ کیا ہم سے گھبرا گیا ہے؟ اسماعیل نے میرے لیے مدینہ جانے کی اجازت طلب کی، حضرت سلطان نے فرمایا کہ ذرا فرصت مل جائے تو ملاقات کے بعد سب فیصلے ہوں گے، اس طرح ہمارے لیے اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ صبر کے ساتھ مکہ معظمہ میں بیٹھے رہیں۔

حضرت سلطان سے ملاقاتیں:

ایک روز معلوم ہوا کہ حضرت سلطان المعظم جدید برطانوی سفیر کے وثائق اعتماد قبول فرمانے کے لیے جدّہ تشریف لے گئے ہیں اور دو روز وہاں مقیم رہیں گے، حضرت سلطان واپس تشریف لے آئے، تو مجھے دورانِ قیام مکہ معظمہ میں مختلف اوقات میں تین مرتبہ ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ ایک روز امیر سعود کے ساتھ کھانا کھایا، حضرت کے حسن اخلاق اور لطف و نوازش کے شکریے کے لیے الفاظ نہیں ملتے۔

واپسی کا عزم:

اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ منیٰ سے واپسی کے بعد تیسرے چوتھے دن مدینہ منورہ جانے کی اجازت مل چکی تھی، سیٹھ شکور نے فی الفور ایک موٹر میں سیٹ کا بندوبست کیا اور ہم سے

رخصت ہو کر مدینہ منورہ روانہ ہو گئے۔ دو تین روز کے بعد حافظ محمد صدیق صاحب نے بھی موٹر کا بندوبست کر لیا۔ اس وقت تک مجھے خیال تھا کہ دو تین روز کے لیے مجھے بھی مدینہ منورہ میں حاضری کا شرف حاصل ہو جائے گا۔ لیکن سلطان المعظم کے ارشاد کے ماتحت مکہ میں مقیم رہنے اور بعد ازاں ہندوستان کے متعلق اضطراب انگیز خبریں سن لینے سے میں بے حد مضطرب ہو چکا تھا۔ ایک روز عشاء کے وقت منشی احسان اللہ خاں صاحب نے جدہ سے فون کیا کہ تمھارا جہاز ۲۳ رمئی کو جا رہا ہے، اور اس کے بعد بیس روز تک کوئی جہاز ہندوستان نہیں جائے گا۔ میرے لیے مدینہ جا کر ۲۳ ر تک واپس آنا مشکل تھا، اور اگر "دارا" میں نہ جاتا تو جولائی کے آغاز سے قبل ہندوستان پہنچنا غیر ممکن تھا، لہٰذا بادلِ نخواستہ فیصلہ کر لیا کہ سیدھا ہندوستان چلا جاؤں اور مدینۂ منورہ کی زیارت سے دوبارہ شرف اندوز ہونے کو دوسرے موقع پر ملتوی کر دوں، چوں کہ پختہ ارادہ تھا کہ ان سردیوں میں یا آیندہ سردیوں میں مصر و بیت المقدس آنا ہے اس لیے یہی طے کیا کہ اس وقت مدینۂ منورہ کی زیارت بھی کر لوں گا، ہم نے منشی صاحب سے فون پر کہہ دیا کہ ۲۳ تک جدہ پہنچ جائیں گے، لیکن ۲۱ ر کو تار آیا کہ دارا کے جانے میں تقریباً ایک ہفتہ کی تاخیر ہو گئی ہے۔ اگر اس تاخیر کا پہلے علم ہو جاتا تو میں مدینہ ہو آتا، مگر مجھے ایک ہفتہ مدینہ جانے کے لیا کافی نہ تھا، اس لیے کہ کم و بیش چھ روز تو سفر ہی میں صرف ہو جاتے اور اگر خدانخواستہ موٹر بگڑ جاتی تو مزید تاخیر ہو جاتی اور سارا وقت سفر ہی کی نذر ہو جاتا!

مکہ کی زندگی:

منیٰ سے واپسی کے بعد مکہ معظمہ میں ہمارا یہ معمول تھا کہ دن بھر باتیں کرتے رہتے یا سوتے رہتے عصر کے بعد حرم میں پہنچ جاتے، مغرب اور عشاء کی نمازیں لازماً حرم میں پڑھتے نیز طواف کرتے۔ حضرت مولانا عبیداللہ اکثر و بیشتر ایک مرتبہ دن میں ۔۔۔ مرتبہ بعد نماز عشا تشریف لاتے اور بدرجہ اقل ایک مرتبہ ضرور آتے، ان سے قرآن کی تفسیر، ہندوستان کی حالت یا بعض علمی مسائل پر گفتگو ہوتی رہتی، آج کل مولانائے موصوف

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی کی سیرت لکھنے میں مصروف ہیں، حضرت شاہ صاحب کے دینی کارناموں کے متعلق عربی میں ایک رسالہ بھی لکھ چکے ہیں۔ میں نے وعدہ لے لیا ہے کہ رسالہ جلد سے جلد مکمل کر کے عنایت فرما دیں گے۔ تاکہ اسے چھاپ دیا جائے، مولانا عبدالرحمٰن صدیقی سے ملاقات ہوئی۔ ان کے متعلق برادرم محترم شعیب قریشی سے بہت سی باتیں سن چکا تھا، ہم حج کو جاتے ہوئے جدہ پہنچے تو شیخ عبداللہ علی رضا گورنر جدہ نے بتایا تھا کہ عبدالرحمٰن صدیقی ولایت سے آئے ہیں اور مدینہ منورہ گئے ہوئے ہیں، مجھے ان سے ملنے کا بے حد اشتیاق تھے۔ منیٰ میں منشی احسان اللہ خاں صاحب کے مکان پر ملاقات ہوئی، میں نے کہا کہ مکہ معظمہ پہنچ کر ضرور ملوں گا۔ چنانچہ سید امین عاصم مرحوم کے مکان پر، جہاں وہ ٹھہرے ہوئے تھے، میں ملنے کے لیے گیا مگر اس وقت وہ عمرہ ادا کرنے کے لیے تشریف لے گئے تھے، دوسرے روز سنا کہ وہ ہندوستان روانہ ہو گئے۔

سنگِ مَرمَر کے حقے کے لیے کوشش:

میں اپنے رفقائے سفر میں محمد یوسف صاحب کا ذکر کر چکا ہوں، جو آگرہ کے مشہور اہل حدیث بزرگ حاجی وارث علی صاحب تاجر کے فرزند ہیں۔ یوسف صاحب حضرت سلطان المعظم کے لیے سنگِ مرمر کا ایک خوب صورت لیمپ لائے تھے، یہ لیمپ ایک دلکش قبے کی شکل کا تھا اور اس کے قبے میں بجلی کا قمقمہ لگا ہوا تھا، ایک دن یوسف صاحب اسماعیل سے کہہ رہے تھے کہ میرا یہ تحفہ سلطان المعظم کی خدمت میں پہنچا دو، مجھے یہ کیفیت معلوم ہوئی تو کہا کہ تحفہ پہلے مجھے دکھاؤ تاکہ فیصلہ کیا جائے کہ اسے سلطان المعظم کی خدمت میں پیش کیا جا سکتا ہے یا نہیں، اس طرح ہنسی مذاق کرتے رہے، آخر یوسف صاحب نے لیمپ دکھایا، جو بڑا خوش وضع تھا، میں نے پوچھا کہ بتاؤ سنگِ مَرمَر کی اور کون کون سی چیزیں بنتی ہیں، یوسف صاحب نے کہا کہ قلم دان، پیپرویٹ وغیرہ، میں نے کہا کہ حقے بھی بنتے ہیں یا نہیں؟ یوسف صاحب کٹر اہل حدیث، میرا سوال سن کا لاحول پڑھی اور چہرے پر تکلفاً ناراضگی کی علامتیں ظاہر کرنے لگے۔ دوران گفتگو میں مجھے معلوم ہو گیا کہ حقے بنتے ہیں۔

میں نے کہا کہ بھائی مجھے سنگِ مرمر کا حقہ بنوا دو، یوسف نے دوبارہ لاحول خوانی فرمائی اور کہا کہ قلم دان بھجوا سکتا ہوں، لیمپ بھجوا سکتا ہوں، پیپر ویٹ یا اور چیزیں بھجوا سکتا ہوں، لیکن حقے کی بات مجھ سے نہ کریں، میں نے کہا کہ بہتر ہے، حقہ میں اپنے پیسوں سے خرید لوں گا، لیکن اس شرط پر کہ باقی جو جو کچھ بنتا ہے، وہ مجھے بھجوا دو، اسماعیل یوسف کا موید تھا، لیکن کہنے لگا کہ بہتر یہ ہے کہ حقہ خرید کر اس پر لکھو "ہدیہ من جانب یوسف" یا "من جانب اہل حدیث آگرہ" غرض بڑی دل چسپ باتیں ہوتی رہیں، یوسف ہمارے آنے سے چند روز قبل مدینہ چلے گئے تھے۔ واپسی پر ان شاء اللہ ان سے فیصلہ ہوگا، ان کا تحفہ سلطان المعظم کی خدمت میں پیش ہوگیا، نیز انھوں نے خود اہل حدیث آگرہ کی طرف سے سلطان المعظم کی خدمت میں سلام پیش کیا۔ سلطان نے تحفہ کا شکریہ ادا کیا اور اہل حدیث آگرہ کو سلام پہنچانے کا پیغام دیا۔

پُر تاثیر خطوط:

مکہ معظمہ مہینے میں تین مرتبہ بیرونی ڈاک آتی ہے، یعنی ۶ر کو، ۱۶ر، کو اور ۲۶ر کو اور تین مرتبہ جاتی ہے، ۹ر کو، ۱۹ر، کو اور ۲۹ر کو۔ ۲۶ر کی ڈاک لینے کے لیے میں بعد نماز مغرب ڈاک خانے میں گیا تو شیخ عبدالرحمٰن فرمانے لگے کہ اپنے کام کے لیے آجاتے ہو، ہم سے ملنے کے لیے نہیں آتے۔ میں نے معذرت کی، خاں صاحب اور میں ایک گھنٹہ وہاں بیٹھے رہے، اس لیے کہ ڈاک چھانٹی جا رہی تھی۔ اس میں خط مل گئے لیکن اخبار نہ ملے، خطوط سے ہندوستان کے مزید حالات معلوم ہوئے۔ اس ڈاک میں میرے بچے عبدالسلام اور اس کے ماموں زاد بھائی عبدالباری کا بھی ایک ایک خط تھا۔ یہ خط پڑھ کر بے اختیار میرے آنسو نکل آئے۔ نو سال اور سات سال کے بچوں کے معصومانہ خطوط اور پاک جذبات نے مجھے بے طرح پریشان کیا۔ آپ (سالک صاحب) کی تنہائی، کثرت کار، حالات کی اضطراب انگیز رفتار، امیر احمد خاں کی میرے متعلق پریشانیاں یہ سب چیزیں میرے لیے سارے سفر میں موجب تشویش بنی رہیں۔ لیکن عبدالسلام اور باری کے خطوں سے میں بے حد متاثر ہوا، اغلب ہے کہ خط سلام کے ماموں نے لکھوائے ہوں مگر بچوں کے

قلم سے ایسے پاکیزہ جذبات نکلے ہوئے دیکھ کر کون متاثر نہ ہوگا۔

سلام اور باری کے خطوط:

سلام کے خط کا متن یہ ہے:

السلام علیکم: میں اداس نہیں ہوں، آپ کو یہ سفر مبارک ہو، ہر وقت آپ کے لیے دعا کرتا ہوں، خداوند کریم آپ کو ہر بلا سے محفوظ رکھے، اس خط کے ہوائی جہاز کے ذریعے آپ کے پاس پہنچنے سے بہت پہلے میری دعائیں عرش پر پہنچ رہی ہیں۔ اس لیے میرے دل کو اطمینان ہے کہ وہ جس کے بھروسے آپ ہم کو چھوڑ گئے ہیں، آپ کی حفاظت کر رہا ہے۔ میں جب بڑا ہوں گا تو ایسے سفر میں میں بھی آپ کے ساتھ رہوں گا اور آپ کی حفاظت کروں گا۔ آہا کیسا اچھا وقت ہوگا!

عبدالباری کے خط کا متن یہ ہے:

میں اور عبدالسلام خوب کھیلتے ہیں، ابا جی آپ کے سفر کا حال بتایا کرتے ہیں۔ اترسوں آپ کے خیریت سے پہنچنے کا تار پڑھ کر سنایا، بہت خوشی ہوئی، اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا، خدا آپ کو خیرت سے واپس لائے۔ آپ کا عبدالباری

مولانا عبیداللہ کی نوازشیں:

اسماعیل نے یہ خط دیکھے تو وہ بھی متاثر ہوا، حضرت مولانا عبیداللہ کو خط سنایا تو وہ بھی بے حد متاثر ہوئے۔ دوسرے روز صبح کے وقت آئے تو دو پونڈ ساتھ لے آئے، فرمانے لگے کہ میری طرف سے ایک پونڈ عبدالسلام کو دے دینا اور ایک پونڈ اس کی بہن امۃ السلام کو دے دینا، میں نے عرض کیا کہ خدا کے لیے معاف کیجیے۔ ہمارا فرض یہ ہے کہ آپ کی خدمت کریں نہ کہ آپ پر بوجھ ڈالیں۔ میں اپنے بچوں کے لیے آپ سے صرف ایک چیز کا طلب گار ہوں جو میرے لیے پونڈوں سے زیادہ قیمتی ہے۔ وہ ہے آپ کی دعائے خیر، حضرت مولانا نے پھر اسماعیل سے کہا کہ بھائی آپ میری طرف سے ہندوستان جا کر مہر کے بچوں کو ایک ایک پونڈ دے دیں۔ اسماعیل نے بھی کہہ دیا کہ اس کی ضرورت نہیں، آپ اس ذکر کو ترک فرما دیں۔ شام کو حضرت مولانا تشریف لائے تو فرمانے لگے، میرے پاس

ایک بزرگ کا عطا کیا ہوا کپڑا ہے، وہ لے جاؤ اور عبدالسلام اور امۃ السلام کو کپڑے بنوا دینا۔ میں نے پھر ادب کے ساتھ معذرت کر دی اور کہا ہم سب کو آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو خوش رکھے، اس کے سوا کسی چیز کی ضرورت نہیں۔

دلچسپ دعوتیں:

حضرت مولانا نے ایک روز اپنی اقامت گاہ پر چائے کی دعوت کی، جس میں اسماعیل، میں، خاں صاحب، پروفیسر عبدالحی صاحب اور خواجہ غلام محمد صاحب شریک ہوئے۔ مولانا عزیز الرحمٰن ہزاروی حضرت مولانا کے ساتھ اہتمامِ دعوت میں شریک تھے، ہم نے دعوت اس لیے قبول کر لی تھی کہ حضرت مولانا کی دل شکنی نہ ہو، مگر حضرت نے بڑا تکلف کیا اور ایسی دعوت دی جس پر بلا شائبہ و مبالغہ "ہنگامہ خیز" کا اطلاق ہوسکتا ہے۔ ایک روز بوہرہ جماعت کی طرف سے کھانے کی دعوت آئی۔ میں، اسماعیل، خاں صاحب اور پروفیسر عبدالحی عرب اس میں شریف ہوئے، یہ دعوت رباط بواہر یا محل سیفیہ میں ہوئی تھی۔ بوہرہ جماعت کے آدابِ طعام مجھے اس دعوت میں معلوم ہوئے۔ دستر خوان بچھا، سب سے پہلے عود سلگایا گیا پھر ایک بلوری کٹوری میں شربت آیا، کٹورہ طاس میں رکھا ہوا تھا اور اس کے ساتھ چھوٹی سی پیالی تھی۔ باری باری ہر شخص نے اس میں سے ایک ایک گھونٹ شربت پیا، ہمیں معلوم نہ تھا اس لیے ایک ایک پیالی پی۔ بعد ازاں ایک بڑے طاس میں کھانا آ گیا، جو بے حد پُر تکلف تھا اور کئی قسم کا تھا۔ درمیان میں بلور کی ایک پیالی میں نمک رکھا تھا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ پہلے نمک چکھنا چاہیے، ہم نے نمک چکھنے کے بعد عرض کیا کہ آپ کے جو آداب ہوں ان کے مطابق ہمیں کھانا کھلایئے۔ اس پر مہتمم صاحب رباطات بواہر جو ہر سال جماعت بواہر کے امیر بن کر آتے ہیں، یکے بعد دیگرے ایک ایک پلیٹ طاس میں رکھنے لگے اور ہم سب کھانے لگے۔ تین چار قسم کا گوشت تھا، روٹی تھی، پلاؤ تھا، تربوز اور خربوزے تھے، میوے تھے۔ ان کے بعد نمک چکھا گیا۔ آخر میں آئس کریم کھائی گئی۔ بے حد پرتکلف کھانا تھا، کھانے کے بعد دیر تک رباط کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔

فرانسیسی جہاز کا واقعہ:

۲۵ر کو سیٹھ شکور کا خط جدہ سے ملا، جس میں درج تھا کہ مدینہ سے واپس آ گیا ہوں لیکن جو سامان تھا وہ راستے میں جل گیا۔

جس رات شرکتِ نجاح کی موٹریں جلیں، اسی رات اور تقریباً اسی وقت جدہ کی بندرگاہ میں ایک فرانسیسی جہاز کو آگ لگ گئی، کپتان نے سب سے پہلے کشتیاں اتار کر حاجیوں کو ان پر سوار کرانا چاہا مگر اضطراب اور گھبراہٹ میں لوگ اس طرح کشتیوں میں گرے کہ کپتان بالکل بے بس ہو گیا۔ ایک کشتی حاجیوں سے بھری ہوئی الٹ گئی، اردگرد جو جہاز کھڑے تھے ان کے افسروں نے فوراً کشتیاں بھیج دیں اور ان کی مدد سے اکثر حاجیوں کو بچایا جا سکا، منشی احسان اللہ خاں صاحب فرماتے ہیں کہ مجھے جہاز کو آگ لگنے کی اطلاع ملی تو لانچ پر سوار ہو کر گیا، مگر رات کی تاریکی میں راستہ نظر نہیں آتا تھا، اور میں بتا چکا ہوں کہ جدے کی بندرگاہ میں آب دوز پہاڑیاں ہیں، جن کی وجہ سے بندرگاہ سے جہازوں تک پہنچنا روشنی کے بغیر ممکن نہیں، بڑی مشکل سے منشی صاحب کی لانچ جہاز تک پہنچی۔ اس حادثۂ فاجعہ میں اکثر حاجیوں کا سارا سامان جل گیا، آخری اطلاع یہ تھی کہ کم و بیش ایک سو اکانوے آدمی بے پتا ہیں، سلطان کو اطلاع ملی تو فی الفور حکم بھیج دیا کہ ساری کشتیاں حاجیوں کی امداد کے لیے وقف کر دو، دوسرے روز حاجیوں کو مختلف جہازوں سے اتار کر ساحل پر لایا گیا، حکومت کی طرف سے انھیں کھانا کھلایا گیا۔ ہر ایک کو پندرہ ریال (بیس روپے دس آنے) فی کس کے حساب سے امداد دی گئی اور روانہ کیا گیا۔ ہم نے واپسی کے وقت جدے کی بندرگاہ میں جلے ہوئے جہاز کو کھڑا دیکھا، اسی رات اسی وقت جدے میں ایک مکان جل گیا۔

مکہ معظمہ کی گرمی:

ہمارے قیام کے آخری دنوں میں گرمی بے حد بڑھ گئی تھی، دن بھر دروازے بند کر کے پڑے رہتے فرش بھی تپتا، جسم کے کپڑے بھی تپتے، لو بھی چلتی، جو لوگ بھی حج کے لیے آنا چاہیں، انھیں چاہیے کہ وہ حج سے ایک مہینہ قبل حجاز پہنچ جایا کریں، تاکہ پہلے مدینہ ہو آئیں، پھر حج سے فارغ ہوتے ہی ہندوستان چلے آئیں، آج کل حج بہت اچھے موسم میں

ہوتا ہے اور وسط مئی تک زیادہ گرمی نہیں ہوتی، لیکن سمندر میں سکون رہتا ہے، بعد ازاں گرمی بھی بڑھ جاتی ہے اور سمندر میں بھی جوش پیدا ہو جاتا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ تمام حاجی حج و زیارت سے فارغ ہو کر گرمی بڑھنے تک ہندوستان پہنچ جایا کریں۔

مکہ معظمہ سے روانگی:

۲۸ر کی شام کو اطلاع ملی کہ دارا جہاز پہنچ گیا ہے اور ۲۹ر کی صبح کو روانہ ہو جائے گا، رات کے گیارہ بجے کے قریب ہمارے لیے ایک موٹر اور سامان کے لیے ایک لاری آ گئی، پروفیسر عبدالحی بھی ہمارے ساتھ تیار ہو گئے۔ بارہ بجے تک سامان لاری میں رکھا گیا، حضرت مولانا عبیداللہ، خان صاحب اور مولانا عزیز الرحمٰن صاحب ہمارے پاس بیٹھے رہے، خواجہ غلام محمد مدینہ منورہ جا چکے تھے، رات کے ساڑھے بارہ بجے ہم نے طواف وداع کیا، مکہ پہنچنے پر عمرہ کا طواف شروع کیا تھا، تو ایک مرتبہ حجر اسود کو بوسہ دینے کا وقت ملا تھا، بعد ازاں حاجیوں کی کثرت کے باعث حجر اسود تک جانا بھی نصیب نہیں ہوا تھا، البتہ ایک مرتبہ مغرب کی نماز کھڑی ہونے والی تھی کہ استلام کا موقع مل گیا، طواف وداع کے وقت چونکہ طائفین کی تعداد زیادہ نہ تھی، اس لیے ہر شوط میں استلام کا موقع مل گیا، دوگانہ ادا کیا اور باب الوداع سے ہو کر باہر آ گئے، چراغ دین پہلوان بھی ہمارے ساتھ ہو گیا تھا، اسے سامان والی لاری میں بٹھایا، میں، اسماعیل اور پروفیسر عبدالحی موٹر میں سوار ہوئے، حضرت مولانا عبیداللہ سے معانقہ کیا، تو بے اختیار آنسو نکل آئے، خان صاحب سے معانقہ کیا، مولانا عزیز الرحمٰن صاحب سے معانقہ کیا، میں نے حضرت مولانا سے عرض کیا کہ میرے لیے اور میرے بچوں کے لیے دعا فرمایئے، حضرت نے ارشاد فرمایا کہ میری طرف سے بچوں کو پیار کرنا، آخر میں ہم سب نے خان صاحب کی نوازشوں کا شکریہ ادا کیا اور رات کے ڈیڑھ بجے ہماری موٹریں روانہ ہو گئیں، تین بجے کے قریب بحرہ میں پہنچے، جہاں موٹریں ٹھہر گئیں، میں شام کے وقت تھوڑی دیر کے لیے سو چکا تھا، اسماعیل کو دن بھر آرام نصیب نہیں ہوا تھا، لہٰذا اسماعیل بحرہ میں چارپائی لے کر سو گیا، میں موٹر میں سو گیا۔ پروفیسر عبدالحی چائے پیتے رہے اور باتیں کرتے رہے، صبح اٹھ کر روانہ ہوئے، اغامہ میں نماز پڑھی اور سات بجے کے قریب منشی احسان اللہ خان کے مکان پر پہنچ گئے۔

جدہ کی مصروفیتیں

حافظ محمد صدیق کے ساتھ وعدہ تھا کہ اکٹھے چلیں گے، اس لیے ہم نے منتیں کر کر کے ان کے لیے اپنے ساتھ سیٹوں کا انتظام کرایا تھا، مگر افسوس کہ موٹریں نہ ملنے کے باعث وہ بروقت جدہ نہ پہنچ سکے، ان کی آدھی پارٹی پہنچ چکی تھی، مگر وہ نہ آسکے، اس کا ہم کو بے حد قلق ہوا، منشی صاحب کے مکان پر چھاچھ پی، حقہ پیا، سب نے غسل کیا۔ منشی صاحب ناراض تھے کہ دو روز پہلے کیوں نہ آئے، ہم نے ان سے فون پر کہہ دیا تھا کہ ۲۸ر کی شام کو جدہ آئیں گے، اس لیے انھوں نے ۲۸ر کی شام کو کھانے کا انتظام کر رکھا تھا اور بعض دوستوں کو بھی بلایا تھا، مگر ہم نہ پہنچ سکے، اس وجہ سے بھی خفا ہو رہے تھے۔ علامہ سید توفیق شریف سے ابھی تک ملاقات نہیں ہو سکی تھی، ہم جدہ پہنچے تو وہ مکہ گئے ہوئے تھے ہم رات کو مکہ گئے تو وہ جدہ آ گئے، بعد ازاں نہ وہ مکہ آئے نہ ہم جدہ گئے، انھیں بلوایا گیا، بڑی محبت اور گرم جوشی سے ملے، مفصل باتیں ہوئیں، اس کے بعد کھانا آ گیا، سب نے مل کر کھانا کھایا، منشی صاحب دفتر چلے گئے، ہم باتیں کرتے رہے۔ علامہ سید توفیق شریف چند روز میں انگورہ جانے والے ہیں، اس کے بعد شاید ہندوستان آئیں۔ علامہ موصوف نے تمام ہندوستانی دوستوں کو اور علی الخصوص آپ کو (سالک صاحب) علامہ اقبال کو، نواب ذوالفقار علی خاں اور چودھری محمد حسین صاحب کو محبت بھرا سلام بھیجا، گیارہ بجے کے قریب ہم منشی صاحب کی موٹر میں روانہ ہوئے، کچھ چیزیں بھی منشی صاحب نے ساتھ کر دی تھیں، جن میں سے خاص طور پر قابل ذکر تمباکو، حقے کی نے، دو چلمیں اور کوئلے ہیں، ساڑھے گیارہ بجے لانچ پر بیٹھ کر جہاز پر آ گئے۔ سامان ہم سے پہلے جہاز پر پہنچ چکا تھا۔ علامہ سید توفیق شریف سے اور منشی صاحب سے رخصت ہوئے اور جہاز روانہ ہو پڑا۔ سیٹھ شکور ہم سے پہلے جہاز پر پہنچ گئے تھے۔ کاش حافظ محمد صدیق بھی آ جاتے۔ ان کے نہ پہنچنے کا بے حد افسوس رہا۔

(انقلاب: ۱۳ر جولائی ۱۹۳۰ء ص ۳، ۴، ۵)

باب ہشتم

مراجعت کا بحری سفر

۵ جون ۱۹۳۰ء

دارا جہاز (عدن و کراچی کے درمیان)

ہم ۲۶ رمئی کو جمعرات کے دن جہاز پر سوار ہوئے تھے۔ ۳۰ رمئی کو دفعۃً حضرت مولانا قاضی سلیمان منصور پوری کا انتقال ہوگیا، ۳۱ ر سے میں نے قیامِ حجاز کے حالات لکھنے شروع کیے۔ کچھ حالات مکہ معظمہ میں لکھ لیے تھے، لیکن چونکہ گرمی بہت زیادہ بڑھ گئی تھی، نیز مصروفیتوں میں بے طرح الجھ گیا تھا۔ اس لیے پانچ چھ صفحوں سے زیادہ نہیں لکھ سکا تھا اور تکمیل حالات کے لیے قلم دوات لے کر بیٹھا تو پیش نظر ترتیب کے اعتبار سے وہ بھی ناقص نظر آئے، انہیں از سرِ نو لکھنا شروع کیا اور ۲ ر جون کی دوپہر تک سب کچھ مکمل ہوگیا، خیال تھا کہ واپسی کے حالات روزانہ لکھتا جاؤں گا، مگر ۳ ر جون سے سمندر میں کسی قدر گرمی شروع ہوگئی، ۴ ر جون کی صبح کو نماز کے لیے اٹھا، تو جہاز پر رولنگ اور پچنگ دونوں شروع تھے، یعنی وہ شرقاً غرباً بھی ہل رہا تھا اور شمالاً جنوباً بھی، میں نے جلد جلد غسل کیا، تھوڑی دیر میں چائے آ گئی، طلوعِ آفتاب کو ایک گھنٹہ نہیں گزرا تھا کہ سر بے طرح چکر کھانے لگا، اب سرعتِ فکر، طوفان انگیزئ تحریر اور ہنگامہ آرائی کلام، سب غائب تھے، بریک فاسٹ کے لیے کھانے کے کمرے میں گیا تو اشیائے خوردنی کی صورت دیکھ کر معدے میں تلاطمِ امتلا شروع ہوگیا، سیٹھ عبدالشکور اور اسماعیل باتیں کرنا چاہتے تھے، مگر میں نے ہاتھ ہلایا اور عرض کیا کہ للہ معاف کرو۔ اسماعیل، ظالم اسماعیل کو میری اس حالت پر ہپ ہپ ہُرّے کی سوجھی، میں خونِ جگر پی کر اپنی

سیٹ پر لیٹ گیا، میری طرح اکثر اہل جہاز پر "مرض البحر" (Sea Sickness) طاری ہو گیا تھا، علی الخصوص ان تھرڈ کلاس والوں پر جو جہاز کے نچلے حصے میں اور سطح جہاز پر بیٹھے تھے، وقتاً فوقتاً ایک آدھ کو قے ہو جاتی تھی، قے کی مہیب اور مکروہ آوازیں میرے کانوں میں پہنچ رہی تھیں، اور خود میرے معدے کے لیے "بانگِ درا" بن رہی تھیں، طبیعت بے چین تھی، ڈاکٹر مرزا امام الدین صاحب نے آتے وقت مجھے اور اسماعیل کو سرخ رنگ کے سفوف کی ایک ایک شیشی دی تھی اور فرمایا تھا کہ یہ معدے کے لیے بہت مفید ہے، علی الخصوص "مرض البحر" کے لیے، میں نے جھٹ تھوڑا سا سفوف کھایا، اس کے بعد قے تو نہ ہوئی، لیکن حضرت حکیم فقیر محمد صاحب چشتی نظامی کی اصطلاح میں "بند ہیضے" کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ معدے کے اندر قے کی تمام علامتیں ہنگامہ آرا تھیں، مگر وہ کوئی صورت اختیار نہیں کرتی تھیں، اسماعیل میری اس بے بسی پر بہت خوش تھا۔ ۴؍ جون کو لنچ چھوڑا، عصرانہ چھوڑا (شام کے چار بجے کی چائے) شام کے وقت طبیعت قدرے سنبھلی تو کیبن ہی میں کچھ ٹماٹر، کچھ آلو، دو انڈے اور لیمو منگائے اور چند نوالے کھائے، ۵؍ جون کی دوپہر تک یہی حالت رہی، سمندر کی طرف دیکھا تو منظر میں کچھ زیادہ فرق نظر نہ آتا تھا، مگر جہاز کی بے کسی اور اس کے ساتھ ہماری بے بسی انتہا کو پہنچ چکی تھی، ۵؍ کو دوپہر کے بعد طبیعت قدرے اچھی ہوئی، شاید اس لیے کہ رولنگ اور پچنگ اجنبی چیزیں نہیں رہی تھیں، چاند کی آٹھ سے پہلے پہنچنے کی امید نہیں تھی، اب ڈپٹی محمد شریف صاحب کی حالت پر رشک آتا تھا، زیارت مدینہ منورہ سے محرومی میں ہم ان کے شریک تھے، مگر وہ فی الفور واپسی کا عزم کر کے موسمی ہواؤں کے سمندر میں داخل ہونے سے قبل ہندوستان پہنچ گئے اور ہم دس پندرہ دن تذبذب میں گزارنے کے بعد ان کی طرح زیارت سے محروم آئے، اس محرومی کے ساتھ اور شاید اسی کی پاداش میں موسمی ہواؤں کی ہنگامہ خیزی میں بھی پکڑے گئے۔

بعض دلچسپ حالات:

میں سابقہ ترتیب دادہ حالات میں بعض واقعات بھول گیا۔ ایک اہم بات یہ ہے کہ پروفیسر عبدالحی صاحب عرب کی شفقت دورانِ قیامِ مکہ معظمہ میں روبہ اضافہ رہی اور اب بھی روبہ اضافہ

ہے۔ ایک دن جوشِ محبت میں حضرت مولانا عبیداللہ کے سامنے اس پیچ میرز کی بہت تعریف فرماتے رہے، ایک دن میں نے عرض کیا کہ دل نہیں لگتا، چلیے باب السلام سے کتابیں خرید لائیں۔ اگرچہ دوپہر کا وقت تھا اور دھوپ تیز تھی، مگر پروفیسر صاحب فی الفور اٹھے اور میرے ساتھ تاجران کتب باب السلام کی دکانوں پر چلے گئے۔ جہاں سے پروفیسر صاحب نے متعدد کتابیں خریدیں، مجھے متنبی کے دیوان کا ایک نسخہ پسند آیا۔ نیز قصیدہ ابن بدرون معہ شرح۔ یہ غالباً وہی قصیدہ ہے جس کے متعلق حضرت علامہ اقبال نے مرثیہ سسلی میں اشارہ کیا ہے:

آسماں نے دولتِ غرناطہ جب برباد کی
ابن بدروں کے دلِ ناشاد نے فریاد کی

پروفیسر صاحب نے ان دونوں کتابوں کی قیمت بہ اصرار خود ادا کی اور جب دارالکسوہ میں پہنچے تو دونوں کتابیں بطور یادگار مجھے عنایت فرما دیں اور ان پر تہدیہ کی عام عبارت اپنے قلم سے لکھ دی۔

سیٹھ شکور نے مدینہ کے سفر کا ایک نہایت دل چسپ واقعہ سنایا۔ سیٹھ صاحب نے موٹر میں اپنے لیے ڈرائیور کے ساتھ کی سیٹ مخصوص کرائی تھی، ڈرائیور ہندوستانی تھا، لیکن سیٹھ صاحب کے باقی رفقا مصری تھے، ان میں ایک ''جوڑا'' بھی تھا۔ میاں ڈرائیور کے پیچھے بیٹھے تھے اور بیوی سیٹھ صاحب کے عقب میں، جب راستہ خراب آتا تو پے در پے معدہ جنباں دھچکے لگنے لگے۔ جب دھچکا لگتا، تو مصری میاں ڈرائیور کے ایک دو دھپے رسید کر دیتے اور کہتے آہستہ آہستہ چلاؤ، بیوی نے میاں کو اس کارِ خیر میں مشغول پا کر خود بھی ان کا ہاتھ بٹانے کی ٹھان لی۔ اسے سیٹھ صاحب سے قرب تھا اور وہ سمجھتی تھی کہ ڈرائیور کے پاس جو شخص بیٹھا ہے، وہ لامحالہ اسی کی جنس میں سے کوئی ہوگا، مثلاً ممکن ہے کہ موٹر صاف کرنے والا ہو، چنانچہ دھچکا لگتا اور میاں ڈرائیور کی پیٹھ کی تواضع شروع فرماتے تو بیوی صاحبہ انتہائی سادگی اور بے تکلفی کے ساتھ سیٹھ عبدالشکور کی پیٹھ پر ایک ضرب لگا دیتیں اور فرماتیں ''شویا شویا'' (بے تتبع صوت حسب روایت سیٹھ صاحب) بمعنی آہستہ آہستہ، اس طرح غریب سیٹھ

عبدالشکور، جو بمبئی کے بہت بڑے تاجر ہیں، ایک فری میسنری لاج کے ماسٹر ہیں، نواب رام پور کے دوست ہیں اور ہندوستان کے تقریباً ہر شہر میں معزز طبقے کے ساتھ گہرے تعلقات رکھتے ہیں، ڈرائیور کا رفیق ہونے کی غلط فہمی میں سارا راستہ مار کھاتے رہے اور شرم کے مارے یہ نہ کہہ سکے کہ میں موٹر صاف کرنے والا نہیں ہوں، بلکہ سولہ پونڈ ادا کر کے سوار ہوا ہوں، حاجی ہوں اور میری پوزیشن مصر کے کسی میاں بیوی سے کم نہیں، خود سیٹھ صاحب نے بیان کیا کہ کچھ راستہ طے کر چکنے کے بعد بیوی صاحبہ کے پاؤں تھک گئے، تو انھوں نے انتہائی بے تکلفی سے دونوں پاؤں اٹھا کر سیٹھ صاحب کی پیٹھ پر رکھ دیے، سیٹھ صاحب بچارے اس پر بھی کچھ نہ بولے، شاید انھوں نے یہ سمجھا کہ مار کھانے سے پائیدان بنے رہنا بہر حال بہتر ہے۔

والیۂ بھوپال کا انتقال:

اس سال مصر کے مشہور حنفی عالم شیخ امین نجیب بھی حج کے لیے آئے تھے مگر ان سے باتیں نہ ہو سکیں، ایک اور فاضلِ مصر شیخ عبدالوہاب نجار ایک روز اپنے صاحب زادے سمیت ملنے کے لیے آئے، ان سے بڑی دیر تک سیاسیات ہند و مصر کے متعلق باتیں ہوتی رہیں، میں نے ہندوستان کے حالات مختصراً بتائے تو فرمانے لگے کہ ان حالات میں ''انقلاب'' کے مسلک کے سوا اور راستہ بھی کیا ہو سکتا ہے۔ چین کے ایک پُر جوش مسلمان سے ملاقات ہوئی، جو قسطنطنیہ سے تعلیم پا کر وطن جا رہا تھا۔

حج سے واپسی پر ہمیں حضرت سلطان جہاں بیگم والیۂ بھوپال کے انتقال پر ملال کی خبر ملی، جس حاجی کو ہم یہ خبر سناتے۔ رنج و افسوس کا پیکر بن جاتا، شیخ عبدالرحمٰن مظہر نے اسماعیل سے کہہ کر نمازِ جمعہ کے بعد حضرت بیگم صاحبہ مرحومہ کے لیے غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھنے کی اجازت حاصل کی اور جنازہ پڑھایا۔ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو بسر اوقات رحمت میں جگہ دے اور ہندوستان کی مسلم خواتین کو ان کے نقشِ قدم پر چلائے، آہ! ایسی خاتون ہندوستان میں پھر کہاں پیدا ہوگی، اور علی الخصوص رئیسوں میں!

جدے میں حاجی کیمپ:

میں منشی احسان اللہ صاحب کے متعلق اب تک کچھ نہیں لکھ سکا، چند لفظوں میں اتنا عرض کر سکتا ہوں کہ ان کی سعی و کوشش اور اہتمام و توجہ سے ہندوستان کے حاجیوں کے لیے آسایش و راحت کے جتنے سامان جمع ہو گئے ہیں، ان کا اندازہ وہی شخص کر سکتا ہے، جسے ان سے پہلے کے حالات معلوم ہوں۔ منشی صاحب کی تن دہی، جفاکشی، حسن اہتمام و انتظام اور دوڑ دھوپ ستایش سے بالا ہیں، جو انتظامات منشی صاحب نے چار پانچ سال سے کر رکھے ہیں، اب تمام قونصل خانے ان کی پیروی کر رہے ہیں، منشی صاحب کی توجہ اب اس امر پر مبذول ہوگئی ہے کہ جدے میں ہندوستانی حاجیوں کے لیے ایک حاجی کیمپ بنائیں، کیمپ پر لاگت کا اندازہ دس لاکھ روپیہ ہے، نواب آف بیلا [1] بھی اس سال حج کے لیے آئے ہوئے تھے، وہ ایک لاکھ جمع کر دینے کا وعدہ فرما چکے ہیں۔ منشی صاحب غالباً پھر موسمِ حج کے بعد کیمپ کے لیے ایک اپیل شائع کریں گے، اگر یہ کیمپ بن گیا اور یقین ہے کہ ان شاء اللہ ضرور بن جائے گا، اس لیے کہ منشی صاحب جس کام میں ہاتھ ڈالتے ہیں، اسے پایۂ تکمیل تک پہنچا کر چھوڑتے ہیں، تو ہندوستانی حاجی بہت سی مصیبتوں سے نجات پا جائیں گے، اور ان کے لیے جاتے وقت یا آتے وقت جدے میں ٹھہرنا ہرگز تکلیف دہ نہ رہے گا، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ منشی صاحب کی ہمت اور ارادے میں برکت دے اور ان کے نیک عزائم پورے کرے، آمین!

دارا جہاز کی کیفیت:

دارا جہاز نسبتاً پرانی وضع کا جہاز ہے، اس کے مقابلے میں خسرو اور جہانگیر نئے جہاز ہیں، لہٰذا دارا میں آسایش کے وہ سامان نظر نہیں آتے جو پہلے سفر میں جہانگیر میں اور دوسرے سفر میں خسرو میں مہیا تھے، اس میں فرسٹ کلاس کے صرف چھ کیبن ہیں، فرسٹ کلاس اور سیکنڈ کلاس، دونوں درجوں کے مسافروں کے لیے ایک بیت الخلا اور ایک غسل خانہ ہے اور مصیبت یہ ہے کہ مرد اور عورتیں سب اس کو استعمال کرنے پر مجبور ہیں۔ حاجیوں

[1] پاکستان کے صوبہ بلوچستان کی ایک قدیم ریاست

میں سے بعض تو صبر وسکون کے ساتھ نیچے کی منزل میں جا بیٹھتے ہیں۔ لیکن اکثر تھرڈ کلاس والے فرسٹ کلاس والوں کے کیبنوں کے ارد گرد سطح جہاز پر بستر جما لیتے ہیں۔ اس طرح انہیں تو تازہ ہوا ملتی ہے لیکن فرسٹ کلاس والوں کو بڑی تکلیف ہوتی ہے، نہ باہر نکل سکتے ہیں، نہ کھلی ہوا میں بیٹھ سکتے ہیں۔ بلکہ اپنے کیبنوں میں بند رہتے ہیں۔ حاجیوں کا ایک زمانہ دیدہ طبقہ ہے، جس کا حال ہی میں تجربہ ہوا، یہ لوگ تھرڈ کلاس کا ٹکٹ لیتے ہیں اور سب سے پہلے جہاز پر پہنچ کر ڈیک کی بہترین جگہ پر قبضہ جما لیتے ہیں، کرسیاں اور پلنگ ڈال لیتے ہیں، بستر بچھا لیتے، فرش پھیلا لیتے ہیں، اور فرسٹ کلاس سے بھی زیادہ آرام کے سفر کرتے ہیں اور ایک ایک گھنٹے تک نہاتے اور کپڑے دھوتے ہیں۔ اسی طرح فرسٹ کلاس والوں کے بیت الخلا کو استعمال کرتے ہیں، لیکن اپنی چالاکی، کنجوسی اور حالات سے گہری واقفیت کے باعث فرسٹ کلاس کے پیسے خرچ نہیں کرتے اور بلا صرف زر ہی فرسٹ کلاس والوں میں شامل ہو جاتے ہیں۔ سنا جاتا ہے کہ ہمارے ساتھیوں میں سے ایک لکھ پتی بھی اس گروہ میں شامل ہے۔

جب بیت الخلا اور غسل خانے خالی ہوں تو کسی دوسرے شخص کا انھیں استعمال کر لینا میرے نزدیک چنداں موجب اعتراض نہیں ہے لیکن ظاہر ہے کہ اس استعمال کی حد بندی نہیں کی جا سکتی اور اگر حد بندی نہ ہو تو جن شخصوں کے لیے یہ چیزیں مخصوص ہیں، انھیں بے طرح تکلیف ہوگی، ہر انسان میں اتنی ذہانت ہونی چاہیے کہ اپنے درجے سے آگے قدم نہ بڑھائے۔ ہم دوسروں کو کوستے رہتے ہیں کہ ہماری آسایش کا خیال نہیں رکھتے، لیکن خود ہم آپس میں ایک دوسرے پر جو مصیبتیں نازل کرتے ہیں، ان کی شکایت کس سے کی جائے؟ یہ بڑی معیوب بات ہے کہ ایک شخص ٹکٹ تھرڈ کلاس کا لیتا ہے، لیکن چند زاید پیسے خرچ کر کے فرسٹ کلاس والوں کے لیے موجب آفت بن جاتا ہے۔

ناواقفیت کی مصیبتیں:

ایک مصیبت یہ ہے کہ اکثر اشخاص کو انگریزی وضع کے بیت الخلا کے استعمال کا شعور نہیں ہوتا اور اس میں بعض فرسٹ کلاس والے بھی شامل ہیں، اکثر نہیں جانتے کہ

بیت الخلا میں رفع حاجت کے لیے بیٹھنا کس طرح چاہیے، پھر فلش کا استعمال تو بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ حالانکہ فلش کا دستہ جائے نشست کے بالکل برابر لگا ہوتا ہے اور اسے ذرا اوپر اٹھا دیا جائے تو بیت الخلا صاف ہوسکتا ہے، لیکن میں نے بارہا دیکھا کہ اچھے اچھے لوگ بیت الخلا جاتے ہیں اور باہر آجاتے ہیں۔ دوسرا شخص اندر جاتا ہے، تو اس کے پیش رو کی حماقت و نادانی کے تمام مکروہ نتائج اس کی آنکھوں کو مجروح کرنے کے لیے موجود ہوتے ہیں۔

اسماعیل کا ایک دوست:

اس سلسلے میں اسماعیل نے ہمیں اپنے ایک دوست (یا دوستوں کا) ایک دل چسپ واقعہ سنایا جنھوں نے پہلے پہل ٹرین میں سیکنڈ کلاس میں سفر کیا تھا۔ انھیں صبح اٹھ کر رفع حوائج کے لیے ٹائیلٹ روم میں جانے کی ضرورت پڑی تو کیا دیکھتے ہیں کہ اندر تقریباً وسط میں ایک اونچی سی شے کھڑی ہے جو اوپر سے ڈھکی ہوئی ہے دیکھنے والے صاحب نے خیال کیا کہ یہ کسی چیز پر چڑھنے کا پایہ ہے، پھر ادھر ادھر نظر دوڑائی تو دائیں جانب دیوار کے ساتھ کوئی گول گول سی شے لگی ہوئی نظر آئی، یہ منہ دھونے کی سلابچی تھی۔ لیکن اسماعیل کے دوست نے سلابچی کی گولائی سے یہ نتیجہ نکالا کہ یہ پاخانہ پھرنے کی جگہ ہے، بدقسمتی سے سلابچی پرانی وضع کی تھی، جیسی کہ آج کل این ڈبلیو آر کے درمیانہ درجے کی بعض گاڑیوں میں ہوتی ہے، یہ آج کل کی سیکنڈ کلاس کی سلابچیوں کی طرح کھلنے اور بند ہونے والی نہیں ہوتی بلکہ مستقلاً کھلی رہتی ہے اور مستعملہ پانی کے نیچے جانے کے لیے اس کے وسط میں جو سوراخ ہوتا ہے، اسماعیل کے دوست نے خیال کیا کہ یہ پاخانہ کے نیچے جانے کی جگہ ہے، چنانچہ انھوں نے نہایت بے تکلفی کے ساتھ پاخانہ پھرنے کی چوکی پر بازو رکھا اور منہ دھونے کی جگہ پر چڑھ کر بیٹھ گئے۔ فارغ ہوچکنے کے لیے بعد یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ پاخانہ بدستور پڑا ہوا ہے اور نیچے نہیں گیا۔ بڑے غور وفکر کے بعد انھوں نے اپنی چھڑی لی اور اس کے ذریعے سے نہیں معلوم کتنی محنت و مشقت کے بعد پاخانے کو اس تنگ سوراخ میں سے نیچے گزارا، جسے بنانے والوں نے دور آب کے لیے بنایا تھا اور استعمال کرنے والے اب

تک اسے اسی مقصد کے لیے استعمال کرتے رہے تھے، مگر ایک "واقف کار" بزرگ نے اس سے پاخانہ کو گزارنے کا کام لیا، اسماعیل کہتا تھا کہ اس دوست نے یہ قصہ شکایۃً اسے سنایا اور اس بات پر سخت رنج کا اظہار کیا کہ سیکنڈ کلاس کا کرایہ بھی زیادہ ہے اور پاخانے کی بھی مصیبت ہے۔

ہماری تکالیف:

جہاز میں اس طرح کے "واقف کاروں" کی بہت کثرت ہوتی ہے۔ ہم ۲۹ر کو سوار ہوئے تھے۔ ۳۰ر کی صبح کو رفع حوائج کے لیے بیت الخلا کی طرف گئے تو سب سے پہلے "منتظرین" کی ایک قطار نظر آئی، جو بیت الخلا کے دروازے سے شروع ہو کر دور تک چلی آئی تھی، کسی سخت ضرورت مند کا لوٹا ہاتھ میں تھا۔ کوئی ہم جیسا صابر و شاکر لوٹا سطح جہاز پر رکھے کھڑا تھا، ایسے کام میں جو کتنا ہی ضروری اور طبعی کیوں نہ ہو۔ یوں انتظار کرنا زیادہ دلچسپ مشغلہ نہیں ہوسکتا، لیکن بندگی کا عالم اور بے چارگی کا ماتم، انتظار کرنے والوں میں محض فرسٹ کلاس اور سیکنڈ کلاس والے ہی نہ تھے، بلکہ وہ تھرڈ کلاس والے بھی تھے، جنھوں نے بیت الخلا کے قریب کی جگہ پر قبضہ جما رکھا تھا۔ آپ فرمائیے وہاں کون کسی سے جھگڑے، کس سے کہا جائے کہ "بابا تم تھرڈ کلاس والے ہو" اور تمھارے لیے دوسری طرف پاخانے ہیں۔ ٹکٹوں کے درجوں کی نمائش اچھی چیز سہی، لیکن بیت الخلا کے دروازے پر ایسی نمائش میں مصروف ہوتے ہوئے شرم محسوس ہوتی تھی اور یہ بھی ڈر تھا کہ اگر جھگڑا بڑھا اور اس نے نازک صورت اختیار کر لی تو دنیا کیا کہے گی کہ لیجیے صاحب فلاں نے پاخانے پر "جنگ" کی۔ اگر خدانخواستہ اس "محاربۂ عظیم" میں کسی کے چوٹ لگ جاتی تو اور رسوائی ہوتی، خوش و ناخوش انتظار کی مدت گزاری اور جب "باریابی" کا شرف حاصل ہوا، تو اندر کی بدبو اور نجاست نے ناک میں دم کر دیا، اردگرد دیکھا تو ہاتھ پاؤں رکھنے کی جگہ بھی نظر نہ آئی، بیٹھنے کی جگہ، سامنے کی لکڑی کی جالی (جو اس لیے پاخانے میں رکھی جاتی ہے کہ فرش کی نم آلودگی سے کسی کو تکلیف نہ ہو) سب غلیظ ہو چکے تھے۔ اس سانحۂ عظیم کے بعد ہم کپتان صاحب کے پاس گئے، اپنی مشکلات بیان کیں تو اس نے بیت الخلا کو تالا لگوا دیا، کنجی

سیلون میں رکھوا دی اور کہہ دیا کہ فرسٹ کلاس کے جس مسافر کو ضرورت ہو وہ کنجی سیلون سے لے لے۔ ایک روز تو ہم بڑے خوش رہے کہ چلو ایک بڑی تکلیف رفع ہوگئی، لیکن دوسرے تیسرے روز معلوم ہوا کہ اس جیسی کئی کنجیاں ہیں اور کئی اشخاص پاخانے جاتے وقت کنجیاں جیب میں ڈال کر لے جاتے ہیں۔ انجام کار صبر وشکر کے سوا چارہ نظر نہ آیا۔

مسافروں کی لڑائیاں:

اہل جہاز میں اکثر لڑائیاں بھی ہوتی رہتی ہیں، کہیں جگہ پر جھگڑا، کہیں پانی لینے پر پیکار، کہیں کسی نے تھوک دیا اور دوسرے نے ٹوک دیا تو اس پر جنگ، ایک روز میں اپنی سیٹ پر لیٹا تھا کہ باہر سے گرم گفتاری کی آواز آئی، میں نے پروفیسر عبدالحی صاحب سے عرض کیا کہ ''الحرب یا استاذ العرب'' پروفیسر صاحب بے تکلفی سے فرمانے لگے ''المساکین یحاربون بعضھم من بعض'' میں نے کہا، مساکین؟ حضرت الاستاذ فرمانے لگے، نعم المساکین، واحد رجل یرید المقام ویقول ھذا لی والثانی یحارب ویقول ھذا لی، ھکذا یکون المحاربہ، پھر فرمانے لگے،''میں کل پاخانے گیا، جب باہر نکل کر پاخانے کو چابی لگانے لگا تو تھرڈ کلاس کے ایک مسافر نے مجھے آواز دی کہ بند مت کرو۔ میں نے کہا ہذا الرجل فرسٹ کلاس یعنی الدرجۃ الاولیٰ ہو قال درجۃ الاولیٰ؟ این اذہب؟ اجلس امام الناس، ودارا دان یحاربنی، قلت لہ، یا اخی لا تحاربنی اذہب لا باس اذہب، حضرت الاستاذ سے یہ قصہ سن کر میں بے اختیار ہنس پڑا تو وہ انتہائی متانت سے فرمانے لگے، نعم این یروح المسکین۔

انگریزی کھانا:

آپ کو معلوم ہے کہ ہم نے جاتے وقت انگریزی کھانے کا بندوبست نہیں کیا تھا اور کوشش کی تھی کہ ہماری مشرقیت قائم رہے، لیکن دیسی کھانے کا جو تجربہ پچھلی مرتبہ ہو چکا تھا، اس کے تصور سے بھی بدن پر لرزہ طاری ہوتا تھا، میں نے احتیاطاً منشی احسان اللہ صاحب سے کہہ دیا تھا کہ کچھ ٹوماٹو اور نمک ہمارے ساتھ رکھ دیجیے گا۔ انھوں نے غالب مرحوم کے قول کے مطابق ''حکم دوگانہ دادۂ ساز سہ گانہ کردہ ایم'' پر عمل کیا، یعنی ٹوماٹو کے علاوہ آلو،

اناناس اور دوسرے پھلوں کے کوئی ڈیڑھ درجن ڈبے اور بہت سا نمک رکھ دیا۔ میرا خیال یہ ہے کہ جب جی چاہے گا ٹوماٹو کاٹ کر کھا لیا کروں گا، جہاز میں پہنچنے کے بعد کھانے کے متعلق ''وار کونسل'' کا اجلاس ہوا تو سب ممبروں نے متفقہ طور پر طے کیا کہ انگریزی کھانا کھایا جائے، چنانچہ انگریزی کھانے کا بندوبست کر لیا گیا۔ صبح نماز سے فارغ ہوتے ہی توس اور چائے، نو بجے بریک فاسٹ، جس میں کم و بیش پانچ چیزیں ہوتی ہیں۔ ۲ بجے لنچ، اس میں بھی اتنی ہی چیزیں ہوتی ہیں۔ شام کو چار بجے چائے اور توس اور سات بجے ڈنر مزے سے کھاتے ہیں۔ سارا کھانا فی الفور ہضم ہو جاتا ہے، جدہ سے چلے تھے تو جہاز والوں کے پاس نہ برف تھی اور نہ سوڈا لیمن وغیرہ تھے، البتہ نیل کا پانی بکثرت تھا، ایک روز نیم گرم پانی ملا تو پینا مشکل ہو گیا۔ لیکن دوسرے روز طبیعت عادی ہو گئی، عدن سے برف بھی مل گئی، لیمن سوڈا بھی، اب خدا کے فضل سے کوئی تکلیف نہیں۔ منشی صاحب نے جو ڈبے دیے تھے، ان کا بیشتر حصہ حاجیوں میں تقسیم کر چکے ہیں۔

راستے کا منظر:

راستے کے منظر کی نسبت کیا عرض کروں، ہمارا جہاز بحیرۂ قلزم میں بھی ساحل کے ساتھ ساتھ چلتا رہا اور بحیرۂ عرب میں بھی ساحل کے ساتھ ساتھ ہی رہا۔ بحیرۂ قلزم میں روزانہ دو چار چھوٹے چھوٹے پہاڑ نظر آ جاتے تھے، کبھی کبھی ساحل بھی دکھائی دینے لگتا تھا، باب المندب سے تقریباً چالیس میل کے فاصلے پر شام کے وقت دور ایک آبادی سی نظر آئی، جس کے سامنے سمندر میں روشنی کا ایک منارہ تھا، کپتان نے بتایا کہ یہ ''مخا'' جدہ جتنی بڑی آبادی ہے، باب المندب اور پیرم سے ہم تقریباً اسی وقت گزرے جس وقت جاتے ہوئے گزرے تھے۔ اب کے بھی پیرم کی روشنیاں ہی نظر آتی رہیں اور کچھ دکھائی نہ دیا۔

عدن کا قیام:

عدن سے ہمارے جہاز کو کوئلہ اور پانی لینا تھا۔ صبح کے ساڑھے آٹھ بجے کے قریب ہم عدن پہنچے اور ڈیڑھ بجے وہاں سے روانہ ہوئے، ہم نے ہر چند کوشش کی کہ ساحل پر

اترنے کی اجازت مل جائے، مگر حاجیوں کو سارے راستے طاعون کے جراثیم کی طرح سمجھا جاتا ہے، کہیں اترنے نہیں دیتے، ہم اگر کسی دوسرے جہاز پر ہوتے تو اجازت کے بغیر اتر سکتے تھے، شہر میں جا سکتے تھے، مگر حاجیوں کے جہاز میں ہمیں بندرگاہ تک جانے کی اجازت نہ تھی۔ میرا خیال تھا کہ اگر عدن میں اترنے کی اجازت مل گئی، تو آپ کے لیے اور بچوں کے لیے ترکی ٹوپیاں لاؤں گا، جو یہاں بہت عمدہ ملتی ہیں اور بے حد ارزاں ملتی ہیں، لیکن یہاں پہنچ کر بھی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی، عدن کو دیکھنے کا چنداں شوق نہ تھا۔ اس لیے کہ ۱۹۲۵ء میں اسے جی بھر کے دیکھ چکا تھا، دکان دار حسبِ معمول کشتیوں میں چیزیں رکھ کر فروخت کے لیے لے آئے تھے۔ مثلاً سگریٹ، سگار، لیموں، تربوز، روئی، مختلف میوے، اناناس کے ڈبے، دنبے، مخملی مصلے، لیکن بہت گراں قیمت پر فروخت کرتے تھے۔ میں نے کوئی چیز نہ خریدی نہ باہر نکلا۔ جہاز کے چلنے کا وقت قریب آیا، تو خیال پیدا ہوا کہ اچھے مصری سگریٹ مل جائیں، تو چند ڈبے خرید لوں، ایک کشتی میں سے دو چھوٹے چھوٹے ڈبے ملے، لیکن وہ اچھی قسم کے نہ تھے۔ تین روپے فی ڈبہ قیمت بتاتے تھے۔ میں نے دو روپے میں دو ڈبے لیے کوشش کرتا تو شاید ڈیڑھ روپے میں دو ڈبے مل جاتے۔ اس سے ان کے قیمت بتانے اور لینے کا اندازہ فرما لیجیے۔ دنبوں کی قیمت ہوٹل والوں نے پوچھی تو بیس روپے فی دنبہ بتانے لگے۔ لیکن بعد ازاں تیرہ تیرہ چودہ چودہ روپے میں دے گئے۔ اس طرح مصلے بھی کئی لوگوں نے خریدے۔

شامی نَے کی خرید کا مسئلہ:

منشی صاحب کا عطا کیا ہوا حقہ ساتھ تھا، میں نے مکۂ معظمہ میں شام کی بنی ہوئی ایک عمدہ نَے دیکھی تھی، اس جیسی نَے خریدنی چاہی تو اسماعیل نے کہا کہ جدہ سے لیں گے اس لیے کہ وہاں ارزاں بھی ملے گی اور عمدہ ترین ہوگی، جدہ پہنچ کر منشی صاحب سے نَے کی فرمائش کی۔ علامہ سید توفیق شریف کہنے لگے، میں لاتا ہوں، انھیں پکڑ کر بٹھایا، منشی صاحب نے آدمی بازار بھیج دیا۔ ہم خود بندرگاہ چلے گئے، وہاں دیکھا تو منشی صاحب کا آدمی جو نَے

لایا تھا، وہ بہت معمولی تھی، دریافت پر معلوم ہوا کہ جدہ میں اس کے سوا اور کسی قسم کی نَے ہوتی ہی نہیں، اب مجھے اپنے اوپر افسوس ہوا کہ میں نے حقے کے معاملے میں اسماعیل کے مشورے کو درخورِ اعتنا اور شائستۂ اعتماد سمجھا، علامہ سید توفیق شریف نے فی الفور ایک آدمی اپنے ایک دوست کے پاس بھیجا۔ جس کے پاس عمدہ نَے تھی، مگر وہ دوست مکان پر نہ ملے، ناچار ہم اسی طرح جہاز پر آ گئے، منشی صاحب نے جدہ کی نَے بھی رکھ دی تھی اور عمدہ لکھنوی تمباکو کا ایک ڈبہ بھی بھروا دیا تھا۔ نیز کوئلوں کا ایک بکس دے دیا تھا، ۲۹ رکو تو حقہ درست کرنے کا خیال ہی نہ آیا۔ ۳۰ رکو سارا دن قاضی صاحب مرحوم کی عیادت اور تکفین میں گزر گیا۔

حقے کی تیاری:

۳۱ ر کی صبح کو لکھنے بیٹھا تو سب سے پہلے حقہ تیار کر لینا ضروری معلوم ہوا، اپنے ہاتھ سے اس میں تازہ پانی ڈالا۔ چلم میں تمباکو رکھا، سانچے میں کوئلے ڈالے، ایک بوری احتیاطاً ساتھ رکھ لی تھی، اس میں سے ایک ٹکڑا کاٹا اور حضرت الاستاذ (پروفیسر عبدالحی عرب) کے پاس بیٹھ کر آگ بنانے لگا۔ پروفیسر صاحب حقہ یا سگریٹ نہیں پیتے، لیکن میرے ساتھ ہمدردی کی وجہ سے وہ بھی اٹھ بیٹھے اور مشورے سے مجھے مدد دینے لگے، دیا سلائی کی نصف ڈبیہ ختم ہوگئی۔ بوری سمندر کی ہوا سے نم آلود ہو چکی تھی۔ اسے آگ نہ لگنی تھی نہ لگی، میں نے گھبرا کر کہا، حضرت الاستاذ دعا کیجیے اور وہ واقعی ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے لگے کہ یا اللہ آگ ہوجائے، میں نے کہا کہ حقے کی آگ کے لیے انگریزی میں دعا کرنی چاہیے۔ اس کے بعد ایک طرف سے پروفیسر صاحب نے پھونکا پھانکی شروع کی اور دوسری طرف سے میں نے، اس طرح آکسفورڈ یونی ورسٹی کے ایک فاضل پروفیسر اور روزنامہ "انقلاب" کے ایڈیٹر کی مشترکہ کوشش سے حقہ تیار ہوا۔ جسے پی کر اتنا لطف آیا کہ آج تک کبھی نہیں آیا، لیکن جو تکلیف اٹھا چکے تھے اسے دوبارہ اٹھانے کی ہمت نہیں تھی، آخر بعد غور و مشورہ اپنے کیبن کے ملازم کو بلا کر کہا کہ جس وقت ضرورت ہو آگ لا دیا کرے، ہم ضرورت کے وقت کوئلے چلم میں ڈال دیتے اور ملازم انہیں باورچی خانے میں لے جا کر سلگا لاتا،

باورچی خانے میں پتھر کا کوئلہ استعمال ہوتا ہے اس لیے حقہ نوشی کے مصرف میں نہیں آ سکتا۔

آبی جانور:

عدن سے آگے نکل کر روز پہاڑ اور جزیرے نظر آتے رہے لیکن اس کے بعد کوئی خشکی، کوئی پہاڑ اور کوئی ساحل نظر نہ آیا۔ البتہ سیاہ رنگ کے چند جانور اڑتے ہوئے نظر آ جاتے، جن سے پتہ چلتا کہ ساحل زیادہ دور نہیں ہوگا۔ یہ جانور جہاز کے ساتھ ساتھ اڑتے رہتے ہیں اور جب تھک جاتے ہیں تو بے تکلفی کے ساتھ سطح آب پر بیٹھ جاتے ہیں، سنا ہے کہ یہ پانی ہی پر سو جاتے ہیں۔ اڑتے ہیں تو ان کی رفتار اور رخ اپنے اختیار میں ہوتے ہیں، لیکن جب پانی پر بیٹھ جاتے ہیں تو دونوں چیزیں موجوں کے رخ اور رفتار پر موقوف ہو جاتی ہیں، ہمارے جہاز کی رفتار بہت سست ہے۔ جو فاصلہ خسرو نے ساڑھے پانچ روز میں طے کیا تھا، اسے یہ غالباً سات روز میں پورا کرے گا، میں اپنی سیٹ کے پاس کھڑکی میں سے کبھی کبھی سمندر پر نظر ڈالتا ہوں، تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی جوہڑ میں سے گزر رہے ہیں اس لیے کہ ہر سمت حدِ نگاہ تک کچھ اس قسم کا منظر نظر آ جاتا ہے، جیسے کہ خشکی ہوتی ہے۔ بعض اوقات چاندنی میں یوں معلوم ہوتا ہے کہ ریت کے لق و دق صحرا میں سے گزر رہے ہیں، اس میں ہرگز کوئی ہیبت اور ہولنا کی نظر نہیں آتی، لیکن حقیقت میں یہ کتنی ہولناک چیز ہے۔ انسان ہر حال میں بے بس ہے لیکن سمندر کی سطح پر پہنچ کر اس کی بے بسی کی کوئی حد نہیں رہتی۔

۵ر کو سمندر کی حالت قدرے اچھی تھی لیکن ۶ر کو پھر خراب ہو گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہر سمت سے موجیں اٹھتی ہیں اور تھوڑے فاصلے پر جا کر ٹکرا جاتی ہیں، اس تصادم کے ساتھ ہی دس بیس مربع گز میں پانی اوپر کو اٹھتا ہے اور اس پر جھاگ آ جاتے ہیں، دور دور تک جھاگ کے سفید گالے نظر آتے ہیں۔ جہاز ۳ر اور ۴ر کی نسبت زیادہ ہلتا تھا، مگر خدا کے فضل و کرم سے طبیعت پر کوئی بُرا اثر نہیں پڑتا تھا، شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ مرض البحر ایک دفعہ ہو چکنے کے بعد پھر نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ طبیعت ہچکولوں کی عادی ہو جاتی ہے، لیکن اگر

حقیقت یہی ہے، تو پھر سب کو محفوظ رہنا چاہیے، حال آں کہ معاملہ اس کے خلاف ہے، جو لوگ ۳ر اور ۴ر کو مرض البحر میں مبتلا ہوئے تھے۔ ان میں سے کئی آج پھر سر باندھے، سراسیمہ سے پھر رہے ہیں۔ اس لیے کہ ان پر دوبارہ مرض البحر کا حملہ ہوگیا ہے۔

بخاری حاجیوں کی ہنگامہ آرائی:

۵ر کو جہاز میں ایک دل چسپ واقعہ پیش آیا کہ ہندوستان کے ایک حاجی نے عدن سے سولہ سولہ روپے کے دو دنبے خریدے۔ عدن کے دنبے مشہور ہیں، وہ انھیں ہندوستان بطور تحفہ لانا چاہتا تھا، مالک نے دونوں دنبوں کو جہاز کی بالائی منزل میں ٹھہرا دیا اور ان کے لیے چارے کا انتظام کر دیا۔ بخاری حاجیوں کے ایک گروہ کو خدا معلوم کیا سوجھی کہ انھوں نے ۴ر کو ایک دنبہ ذبح کر ڈالا اور کھا گئے۔ ۵ کو دوسرا دنبہ ذبح کر چکے تھے کہ مالک پہنچ گیا، بڑی ہنگامہ آرائی ہوئی۔ بخاری کہتے تھے کہ ان کے ایک آدمی نے ان کے لیے دو دنبے رکھے تھے اور ہم نے وہی دنبے کھائے ہیں لیکن مالک کہتا تھا کہ یہ میرے دنبے تھے، بڑی رد و کد کے بعد فیصلہ بخاریوں کے خلاف ہوا۔ یہ بھی معلوم ہوگیا کہ ان کے دنبے ابھی تک صحیح و سالم ہیں۔ آخر کار بخاری مالک کو قیمت ادا کرنے پر رضا مند ہوگئے۔

محرم الحرام کی محفلیں:

شام کے وقت ہم اوپر کی منزل میں بُرج کے نیچے ٹہلنے کے لیے گئے تو معلوم ہوا کہ کسی حاجی کا دوپہر کے وقت انتقال ہوگیا تھا اور اسے جہاز والوں نے کفنا کر حوالۂ آب کر دیا۔ ہم سب کو بڑا افسوس ہوا کہ جنازہ نہ پڑھ سکے، جہاز کی آبادی اگرچہ محدود ہوتی ہے اور اس میں موت ایسے اہم حادثے کے متعلق ساری آبادی کو جلد اطلاع مل جانی چاہیے، مگر یہ عجیب بات ہے کہ اکثر و بیشتر معاملات میں سارے حاجی ایک دوسرے سے الگ رہتے ہیں اور عموماً واقعات کی خبر نہیں ہوتی۔

۵ر کو لنچ کے بعد پروفیسر عبدالحی صاحب حضور سرورِ کائنات ؐ کی سیرتِ پاک کے بہت سے واقعات نہایت پرتاثیر انداز میں سناتے رہے، محرم الحرام کی ۷ر تاریخ کو ایرانیوں کی

ایک جماعت نے محفل عزا منعقد کی اور اس کے بعد ۸ر اور ۹ر کو محفلیں ہوئیں، علی الخصوص ۹ر کو رات کے ایک بجے تک ماتم ہوتا رہا۔ پروفیسر عبدالحی صاحب ایک روز آپ کے متعلق (سالک صاحب کے متعلق) بہت سی باتیں پوچھتے رہے اور تقریباً ڈھائی تین گھنٹے تک آپ ہی موضوع گفتگو رہے، پروفیسر صاحب نے بھی آپ کو محبت بھرا سلام کہا ہے اور حضرت مولانا عبیداللہ اور خان محمد خان صاحب نے بھی، ایک روز حضرت شور بازار کے ایک خلیفہ سید امیر سے بڑی دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ جو واپسی میں ہمارے رفیق سفر تھے۔ ایک روز مولانا عبدالرب صاحب کوکب ایڈیٹر "اتالیق" ملاقات کے لیے تشریف لائے

کراچی کے احباب:

واپسی میں ہمارا سفر سخت تکلیف دہ ہو گیا تھا۔ جہاز کی آہستہ خرامی نے اس تکلیف میں بے حد اضافہ کر دیا بلکہ حقیقۃً تکلیف کا منبع بھی آہستہ خرامی تھی۔ حاجی جہاز میں پریشان تھے، مگر جہاز والے کوئلہ بچانے کی فکر میں بڑی آہستگی کے ساتھ آ رہے تھے، عام اندازے کے مطابق جہاز کو جمعہ کے روز کراچی پہنچ جانا چاہیے تھا مگر وہ اتوار کی صبح کو کراچی پہنچا، ہفتے اور اتوار کی درمیانی شب کو تین بجے کے قریب میری آنکھ کھلی تو کراچی کے دونوں لائٹ ہاؤس نمایاں تھے، بلکہ بندرگاہ کی روشنیاں بھی نمایاں دکھائی دے رہی تھیں۔ میں نے کراچی میں سیٹھ عبداللہ ہارون کو تار دے دیا تھا، چھ بجے کے قریب ہمارا جہاز لنگر انداز ہوا تو سیٹھ عبداللہ ہارون پہلے سے ہمارے انتظار میں موجود تھے، تھوڑی دیر کے بعد وہ جہاز پر آ گئے، آٹھ بجے کے قریب ہم نیچے اترے۔ حاجی سیٹھ عبدالشکور صاحب تاجر، حاجی عبدالغنی صاحب صدر حج کمیٹی، عبدالقادر صاحب محافظ حجاج، سب نے انتہائی شفقت سے خیر مقدم کیا اور سامان اتروانے میں ہمیں مدد دی، حافظ شریف حسین بھی وہیں مل گئے، ان سے ہندوستان کے سیاسی حالات کے متعلق کچھ باتیں ہوتی رہیں۔ سیٹھ شکور اسی جہاز میں بمبئی جا رہے تھے لیکن ایک دو گھنٹے کے لیے اتر گئے، ہم نے ان سے رخصتی معانقہ کیا، نو بجے کے قریب اسماعیل صاحب حاجی عبدالغنی کی دکان پر اتر گئے، میں اور پروفیسر عبدالحی عرب نے سیٹھ عبداللہ ہارون کے ہاں چائے پی، پھر ریل کی

سیٹوں کا انتظام کیا، پروفیسر کی ٹرین دوسرے روز صبح کو جاتی تھی، اس لیے وہ اسٹیشن کے قریب ایک ہوٹل میں مقیم ہوگئے، میں دن میں مولانا آزاد سبحانی سے (جو کراچی آئے ہوئے تھے) شیخ عبدالمجید صاحب سے، حاجی سیٹھ میر محمد بلوچ سے، مولانا محمد صدیق صاحب سے، عثمان آغا صاحب سے، مجتبیٰ صاحب سے اور دوسرے احباب و رفقاء سے ملتا رہا، حکیم فتح محمد صاحب[1] ہندوستان سے جاتے وقت بھی نہ مل سکے تھے، اور آتے وقت بھی نہ ملے میں دونوں مرتبہ ان کے مکان اور مطب پر گیا، مگر معلوم ہوا کہ وہ حیدر آباد گئے ہوئے ہیں، دوپہر کا کھانا سیٹھ صاحب کے ساتھ کھایا، شام کے چھ بجے میں سیٹھ صاحب سے رخصت ہوکر حاجی عبدالغنی صاحب کی دکان پر آ گیا، یوسف اور محمود بارہ ایک بجے کے بعد محرم دیکھنے کے لیے چلے گئے، شام کا کھانا حاجی عبدالغنی صاحب نے بہ اصرار کھلایا اور رات کو نو بجے میل پر سوار ہوگئے، حاجی عبدالغنی اسٹیشن تک ہمارے ساتھ آئے۔ راستے میں نو اکھالی کے لطف اللہ چودھری میرے رفیق رہے، ۲۰ر اپریل کو صبح کے ساڑھے نو بجے لاہور سے روانہ ہوا تھا، اور ۹ جون کو شام کے سوا چھ بجے واپس آ گیا۔ دوستوں نے جاتے وقت بھی اس عاجز پر لطف و کرم میں کمی نہیں کی تھی اور آتے وقت بھی میری بساط سے بڑھ کر مجھ پر نوازش فرمائی، خدا سب کو خوش رکھے اور ہر مسلمان کو حج و زیارت کی سعادت سے مشرف فرمائے۔ آمین۔

(انقلاب: ۲۰ر جولائی ۱۹۳۰ء ص ۲، ۳)

---

[1] حکیم فتح محمد سیہون ضلع دادو کے رہنے والے تھے' کراچی میں مطب کرتے تھے' جمعیت علمائے سندھ کے ناظم تھے۔ مشہور اطباء میں ان کا شمار ہوتا ہے۔

باب نہم

مصنف رحمۃ للعالمین آغوش رحمت میں

واپسی کے سفر کا سب سے زیادہ دردناک واقعہ مولانا قاضی محمد سلیمان صاحب منصور پوری مصنف رحمۃ للعالمین وغیرہ کا انتقال پر ملال ہے۔ جب ہم مکہ معظمہ پہنچے تو قاضی صاحب کی طبیعت ناساز تھی۔ میں ان کی عیادت کے لیے گیا، تو بہت کمزور ہو چکے تھے۔ ان کے کمرے میں داخل ہوا تو مجھے پہچان نہ سکے، بالکل قریب پہنچ گیا تو پہچانا۔ حسبِ معمول بڑی محبت سے ملے، بڑی شفقت سے پیش آئے، مزاج پوچھا تو فرمانے لگے کہ اب اچھا ہوں۔ خواجہ غلام محمد میرے ساتھ تھے۔ ان سے معلوم ہوا کہ حضرت قاضی صاحب دارالکسوہ میں آئے تھے، تو انھیں اصرار کے ساتھ لیموں کی سکنجبین پلا دی گئی تھی، جس کی وجہ سے ان کے فمِ معدہ میں درد شروع ہو گیا تھا۔ دوسرے یا تیسرے روز میں پھر مزاج پرسی کے لیے گیا تو بالکل تندرست ہو چکے تھے۔ ذرا سی کمزوری باقی تھی، بڑی دیر تک باتیں ہوتیں رہیں۔ مسئلہ ازدواج بیان فرماتے رہے۔ رحمۃ للعالمین کے تیسرے حصے کا مسودہ دکھایا اور فرمانے لگے کہ اسے پورے اہتمام کے ساتھ اپنے مطبع سے چھپوا دو، میں نے عرض کیا کہ حضرت ہم کس کے ہیں اور مطبع کس کا ہے اور اس سے بڑھ کر ہمارے مطبع کے لیے شرف کی بات اور کیا ہوگی کہ آپ کی رحمۃ للعالمین کا تیسرا حصہ اس میں چھپے۔

مسئلہ ازدواج:

مسئلہ ازدواج کے سلسلے میں بعض بڑے عجیب وغریب واقعات سنائے، فرمانے لگے کہ حضرت عمر فاروق اعظمؓ کے ایک عزیز نے عرب سے باہر کسی گوری چٹی عورت سے شادی

کر لی تھی، فی الفور فاروق اعظمؓ کا حکم پہنچا کہ بیوی کو طلاق دے دو۔ عزیز نے وجہ دریافت کی تو ارشاد ہوا کہ اگر تم لوگوں نے باہر کی گوری چٹی عورتوں سے شادیاں کرنی شروع کر دیں تو عرب کی بھورے اور سانولے رنگ کی کم حسین لڑکیوں سے کون نکاح کرے گا، عزیز گورنر نے یہ سنتے ہی فی الفور اپنی بیوی کو طلاق دے دی۔ حضرت امام اعظمؒ کا ایک واقعہ بیان فرمایا کہ لونڈی خریدتے اور چند روز کے بعد اسے آزاد کر دیتے، مقصود محض یہ تھا کہ نصرانی عوارض اور دوسری ضروریات کے متعلق بعض حالات کی تحقیق ہو جائے اور اس کے لیے ضروری تھا کہ مختلف و متعدد عورتوں سے حالات پوچھتے۔ حضرت قاضی صاحب مرحوم نے اس اثنا میں اناس کا ڈبہ منگوا لیا اور اسے کھلوایا، پلیٹ اپنے پاس رکھ لی، اناس اس میں ڈالا اور مجھے اور خواجہ غلام محمد کو کھلاتے رہے۔ پوچھنے لگے کہ کب تک ٹھہرنے کا ارادہ ہے؟ میں نے عرض کیا، ارادہ تو یہ تھا کہ حج و زیارت کے بعد بیت المقدس جاؤں، بعد ازاں مصر ہوتا ہوا ہندوستان پہنچوں، لیکن ہندوستان کے سیاسی حالات بہت خراب ہو رہے ہیں، اس لیے ضروری ہے کہ بیت المقدس اور مصر کے سفر کو کسی دوسرے موقع پر ملتوی رکھوں! فرمانے لگے یہ بہتر ہے، سردیوں میں اس سفر کا قصد کرنا۔ میں بھی بیت المقدس اور مصر جانا چاہتا ہوں۔ تم اور ہم اکٹھے رہیں گے اور بڑا مزا رہے گا۔ میں نے عرض کیا کہ اس سے بڑھ کر میرے لیے اور کیا سعادت ہو سکتی ہے کہ آپ کی معیت میں بیت المقدس اور مصر کا سفر کروں، غرض بڑی دیر تک اس قسم کی باتیں ہوتی رہیں، فرمانے لگے کہ مہاراجہ بہادر (مہاراجہ پٹیالیہ) کے بچوں کی شادیاں ہیں، میں روانگی سے قبل ملاقات کے لیے گیا تو وہ اپنے کسی مہمان مہاراجہ سے باتوں میں مصروف تھے، میں واپس آ گیا تو میرے پیچھے آدمی بھیجے، خود اسٹیشن پر پہنچے، فرمانے لگے تم سفر پر جا رہے ہو، حالانکہ شادیوں کے سلسلے میں بہت سے انتظامات کرنے کے ہیں، اور تمھارے سوا کون سارے کام انجام دے گا؟ قاضی صاحب کہتے تھے کہ جو کام دوسرے آدمی ایک مہینے میں کرتے ہیں۔ میں ایک دن میں کر دوں گا، جلد واپس آ جاؤں گا آپ اطمینان رکھیں۔ روانہ ہونے لگا تو کہنے لگے پروفیسر عبدالحئی عرب ہمارے دوست ہیں،

ان کے لیے ایک کتاب لیتے جاؤ، چناں چہ اپنی ایک تازہ تصنیف "شرح اسماء الحسنیٰ" نکال کر اور اس پر تھدیہ کی عبارت لکھ کر مجھے دے دی کہ یہ پروفیسر صاحب کو دے دینا۔ مجھ سے فرمانے لگے کہ تمھیں یہ کتاب ہندوستان پہنچ کر ملے گی، اس لیے کہ میں اپنے ساتھ بہت کم نسخے لایا تھا۔ رحمۃ للعالمین کے تیسرے حصے کے متعلق فرمانے لگے کہ ہم نے یہاں کے اربابِ علم کو اس کے مختلف حصے سنائے تھے انھوں نے اسے بہت پسند کیا ہے۔

اس ملاقات کے بعد ہم سب حج پر روانہ ہوگئے۔ عرفات میں ملاقات نہ ہوئی۔ ۱۱ر ذی الحجہ کو عشاء کے وقت میں اور اسماعیل منٰی میں حافظ محمد صدیق صاحب سے مل کر اپنے خیموں کی طرف آرہے تھے کہ راستے میں قاضی صاحب مل گئے۔ فرمانے لگے طواف افاضہ کر کے آرہا ہوں، تھوڑی دیر تک ہم ان کے ساتھ باتیں کرتے رہے۔

حرم میں ملاقات:

منٰی سے واپسی پر ایک روز مغرب کی نماز کے بعد حرم میں ملاقات ہوئی، اس وقت طبیعت بالکل صاف تھی، کمزوری بھی نہیں رہی تھی۔ اسماعیل نے کہا کہ مَہر گرمی سے دل بہت گھبرا رہا ہے، اس سلسلے میں قاضی صاحب ادھر ادھر کے واقعات بیان کرنے لگے، بھٹنڈے کے بعض قصے سنانے لگے اور پھر ضمناً کہا کہ دیکھیے صاحب ہم لوگ اپنی ملازمتوں میں چند روپوں کے لیے سخت سے سخت گرم مقام پر مستقلاً مقیم رہنے میں بھی متامل نہیں ہوتے، لیکن عبادت کے لیے خدا کے گھر میں آئیں تو فی الفور پریشان ہوجاتے ہیں! میرے لیے سبق تھا۔ پھر فرمانے لگے کہ مکۂ معظمہ پہنچنے کے بعد شعریت طبیعت سے بالکل غائب ہوجاتی ہے۔ (شاید اکثر اصحاب کو معلوم نہیں ہوگا کہ قاضی صاحب شاعر بھی تھے) پچھلی مرتبہ حج کے لیے آیا تھا تو ایک موقع پر بے اختیار ایک مصرعہ زبان سے نکل گیا، بعد ازاں ہر چند فکر کیا دوسرا مصرعہ نہ ہوسکا، خدا کا شکر ہے کہ یہاں کی فضا میں اب تک ایسی تاثیر ہے! ہم نے کہا کہ کب تک تشریف لے جائیں گے۔ فرمانے لگے کہ بس جلد چلا جاؤں گا، اس کے بعد ہم نے خیال کیا کہ قاضی صاحب تشریف لے گئے ہیں۔ مدینہ منورہ کی زیارت وہ حج سے

قبل کر چکے تھے، چند روز کے بعد ایک دن خاں صاحب نے کہا کہ قاضی سلیمان صاحب ابھی تک جدہ میں ہیں، میں نے پوچھا کہ آپ کو کیسے معلوم ہوا، خاں صاحب نے فرمایا کہ کسی نے ذکر کیا تھا۔ ہم ۲۹ رمئی کو جہاز پر پہنچے۔ تو خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ قاضی صاحب اس جہاز میں ہیں! چونکہ ہم بالکل آخری وقت میں جہاز پر آئے تھے اور ہم سے پہلے تمام مسافر سوار ہو چکے تھے، اس لیے ہمارے آتے ہی جہاز روانہ ہو پڑا۔

قاضی صاحب کی علالت:

۳۰ رمئی کی صبح کو میں اپنی سیٹ پر لیٹا ہوا امین ریحانی کی تاریخ نجد پڑھ رہا تھا کہ قاضی صاحب کے رفیقوں میں سے عبداللطیف نامی ایک صاحب نے آکر کہا کہ قاضی سلیمان صاحب کی طبیعت بہت ناساز ہے، میں نے ان سے کہا کہ ابھی کپڑے پہن کر چلتا ہوں لیکن دل میں حیران تھا کہ قاضی صاحب اس جہاز پر کیسے آگئے۔ میں نے عبداللطیف صاحب سے پوچھا کہ قاضی صاحب کہاں ہیں؟ عبداللطیف صاحب نے کہا کہ نیچے سیکنڈ کلاس میں ہیں، میں نے فی الفور کپڑے پہنے، اسماعیل کو اطلاع دی، اس نے کہا، تم چلو میں ابھی پہنچتا ہوں، میں گیا تو قاضی صاحب اپنے کیبن میں اوپر کی سیٹ پر بے ہوش پڑے تھے، آنکھیں بند تھیں۔ میں فی الفور ڈاکٹر کے پاس آیا اور اسے ساتھ لے گیا، ڈاکٹر نے نبض دیکھ کر کہا کہ بالکل فکر نہ کرو، نبض اچھی ہے اور اس مریض کے متعلق میرے ایک دوست بھی تاکید فرما چکے ہیں۔ دس بجے پھر آکر دیکھوں گا، میں نے قاضی صاحب کے رفقا سے کیفیت پوچھی تو وہ کہنے لگے کہ جدہ پہنچ کر قاضی صاحب کی طبیعت دوبارہ ناساز ہوگئی تھی، تاہم کل سوار ہوتے وقت خود کشتی سے اٹھ کر جہاز پر آئے، شام کے وقت طبیعت زیادہ خراب ہونے لگی تو ڈاکٹر کو بتایا گیا، انھوں نے دوا دی، دوا پی کر قاضی صاحب وعظ فرمانے لگے۔ جس میں فرائض کی اہمیت پر خاص زور دیتے رہے۔ مغرب کے وقت زبان بند ہوگئی، آنکھیں بند ہوگئیں اور بے ہوشی طاری ہوگئی جو اس وقت تک بدستور طاری ہے، پھر میں اسماعیل کے پاس آیا اور اسے حالت بتائی نیز پروفیسر عبدالحی عرب کو بتایا، وہ دونوں میرے

ساتھ قاضی صاحب کو دیکھنے کے لیے آئے، اسماعیل نے کہا کہ ہمارے پاس دو کیبن ہیں، ہم ایک کیبن خالی کر دیں گے اور قاضی صاحب کو اوپر لے آئیں گے تاکہ انھیں زیادہ آرام ملے، لیکن قاضی صاحب کی بے ہوشی غیر منقطع تھی۔ ہم پھر اوپر آ گئے اور قاضی صاحب کے رفقا کے کہنے پر مرحوم کے اکلوتے فرزند قاضی عبدالعزیز صاحب انسپکٹر مدارس پٹیالیہ کو تار دیا، جس کا مضمون یہ تھا کہ:

''قاضی صاحب سخت بیمار ہیں۔''

آخری لمحے:

نو بجے کے قریب پھر عبداللطیف صاحب آئے اور کہنے لگے کہ اب تک وہی حالت ہے، ہم پھر نیچے گئے، ڈاکٹر کے پاس پہنچے تو وہ کہنے لگا کہ میں انھیں دیکھ چکا ہوں اور میں نے مناسب یہ سمجھا کہ انھیں ہسپتال میں رکھ لوں۔ میں، سیٹھ شکور اور اسماعیل ہسپتال میں ٹھہرے رہے۔ اسماعیل نے ڈاکٹر سے کہا کہ یہ مریض علم وفضل میں ہندوستان میں ممتاز ہے اور ہماری بیش بہا قومی دولت ہے، خدا کے لیے اس پر خاص توجہ مبذول فرمایئے، ہم وہیں کھڑے تھے کہ قاضی صاحب کو تین آدمی اٹھا کر لے آئے۔ ہسپتال کے دروازے پر لاکر انھوں نے رکھ دیا اور کہا کہ مریض کا طائرِ روح نفسِ عنصری سے پرواز کر چکا ہے، ڈاکٹر فی الفور دروازے پر پہنچا، ہم سب سراسیمہ ہو گئے، لیکن ڈاکٹر نے پھر آدمیوں سے کہا کہ تم مریض کو اٹھا کر ہسپتال کے اندر بستر پر لٹاؤ، بستر پر لٹایا گیا، تو پھر آہستہ آہستہ سانس چلنے لگا، ڈاکٹر نے دیکھ کر کہا کہ مریض کے پھیپھڑے اچھے ہیں، دل اچھا ہے، نبض اچھی ہے، صرف کمزوری ہے۔ فی الفور ایک دوائی منگائی اور پلائی اس کے بعد تقویت کے لیے انجکشن دیا، ہم سب وہیں بیٹھ گئے۔ لیکن دل ٹوٹے ہوئے تھے، قاضی صاب کے جاں بر ہونے کی کوئی امید نظر نہیں آتی تھی، چند منٹ کے اندر لمبے لمبے سانس آنے لگے، میں اٹھ کر پاس کھڑا ہو گیا، لبوں میں جنبش پیدا ہوئی، حلق سے کراہنے کی مدھم سی آواز نکلی، ہاتھ میں ایسی حرکت ہوئی جیسی کہ انسانی ہاتھ قلم لے کر کچھ لکھتے وقت کرتا ہے، یہ یاس ونومیدی کے

آخری لمحے تھے۔ قاضی صاحب کے رفقا میں سے ایک صاحب صبر نہ کر سکے اور پکار اٹھے کہ ہندوستان کا چراغ گل ہو رہا ہے۔ ہم سب کے آنسو نکل پڑے، اس اثنا میں قاضی صاحب کی پیشانی پر ہلکی ہلکی شکنیں پڑیں، جو ایک منٹ تک رہیں اور ایک منٹ تک سانس نہ آیا، ہم نے غور سے دیکھا تو علم و فضل اور زہد و تقویٰ کا یہ آفتاب ہمیشہ کے لیے غروب ہو چکا تھا، ہاتھ خود بخود اس طرح آ کر دل پر بندھ گئے تھے۔ جیسے کہ انسان نماز کے اوقات میں نیت باندھتا ہے، چند منٹ رونے دھونے میں مصروف رہے، پھر ڈاکٹر کو اطلاع دی۔ اس نے آ کر دیکھا تو کہا واقعی جان نکل چکی ہے۔ پھر ڈاکٹر مجھے، اسماعیل اور عبدالشکور کو لے کر کپتان کے پاس گیا۔ کپتان نے کہا کہ آپ اپنے مذہب کے مطابق جو رسمیں ادا کرنا چاہیں کریں اور میت تیار ہو جائے تو مجھے اطلاع دی جائے۔ ز میں اسے حوالۂ آب کرنے سے قبل جہاز کو ٹھہراؤں گا۔

میّت کی حوالگی:

اس کے بعد میت کو ہسپتال کے بیرونی حصے میں رکھ کر غسل دیا گیا۔ خوشبو لگائی گئی، احرام کی چادروں میں مرحوم کو کفنایا گیا، پھر میت کو نیچے کی منزل سے اٹھا کر اوپر کی منزل میں لے آئے اور جہاز کے عقبی حصے کو مسافروں سے خالی کرا کے نماز جنازہ کی تیاری کرنے لگے، جہاز والوں کے پاس کینوس کا ایک بڑا ٹکڑا ہوتا ہے جس کے دونوں بازوؤں پر دو ڈنڈے لگے ہوتے ہیں، ان ڈنڈوں کے سروں پر رسے بندھے ہوتے ہیں، اس کینوس میں رکھ کر میت کو جہاز پر سے نیچے اتارتے ہیں۔ جب میت سطح آب کے قریب پہنچ جاتی ہے تو بیرونی ڈنڈے کے دونوں رسے ڈھیلے [illegible] دیے جاتے ہیں اور میت پانی میں اتر جاتی ہے، یہی کینوس بچھا ہوا تھا اور میت کو فی الفور تہ آب پہنچانے کے لیے لوہے کا ایک وزنی ٹکڑا اوپر رکھا ہوا تھا، ہم نے میت کو لا کر اس کینوس پر رکھا، جہاز میں سے صدہا آدمی جنازے کی نماز کے لیے آ گئے۔ اسماعیل نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور رو رو کر دعا مانگی، نماز سے فارغ ہو کر چلے تو لوہے کا ٹکڑا میت کے ساتھ باندھ دیا گیا اور میت نیچے اتار دی، کپتان کو اطلاع دی، لیکن کسی غلط فہمی کے

باعث جہاز میت کو حوالۂ آب کرتے وقت نہ کھڑا ہوا، بلکہ میت حوالۂ آب ہوچکی تو کھڑا ہوا۔ سب لوگ جہاز کے جنگلے کے پاس کھڑے دیکھ رہے تھے، میت سطح آب کے قریب پہنچ گئی، دو منٹ کے بعد باہر کے رسے ڈھیلے کر دیے گئے، میت کینوس سے الگ ہوگئی اور طرفۃ العین میں علم وتقویٰ کا پیکر مقدس بحیرۂ قلزم کی موجوں کا دامن اوڑھ کر ہمیشہ کے لیے غائب ہوگیا۔ اسلامی سال ختم ہوچکا تھا، نئے سال کی پہلی تاریخ تھی، جمعہ کا دن تھا، گیارہ بجے کے قریب انتقال ہوا اور جمعہ کے وقت میت حوالۂ آب ہوگئی۔

قاضی صاحب کے ساتھ سترہ آدمی تھے۔ ان سب کو اسماعیل نے شام کے وقت کھانا پکوا کے بھیجا اور قاضی صاحب کے فرزندِ ارجمند کو انتقال کی دردناک خبر وائرلیس کے ذریعے بھیج دی گئی۔ وَيَبْقَى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ

(انقلاب: ۲۳؍جولائی ۱۹۳۰ء ص ۲)

مولانا مہر کے مزید دو سفرنامے زیرِ طبع

مولانا غلام رسول مہر وفدِ خلافت کے رکن کی حیثیت سے پہلی مرتبہ یکم نومبر ۱۹۲۵ء کو کراچی سے حجازِ مقدس کے سفر پر روانہ ہوئے۔ جہاں اُن کا قیام ۲۲ جنوری ۱۹۲۶ء تک رہا۔ اس دوران انہوں نے عمرہ کی سعادت اور خادم حرمین شریفین سے ملاقاتوں کا شرف بھی حاصل کیا۔ یہ بے حد پُر آشوب اور ہنگامہ خیز دور تھا جس کا مولانا نے نہایت قریب سے مشاہدہ کیا۔

مولانا مہر حجاز میں عمائدین سے اپنی ملاقاتوں اور دیگر مصروفیات کی روداد خطوط کی صورت میں قلم بند کرتے رہے۔ یہ خطوط ایک ایک کر کے روزنامہ ''زمیندار'' لاہور میں شائع ہوتے رہے۔ ان قسطوں کو مرتب کر کے جلد ہی سفرنامے کی صورت میں شائع کیا جا رہا ہے۔

مولانا غلام رسول مہر نے ۱۹۴۶ء میں کشمیر کا سفر اختیار کیا جس کی روداد ''سیرِ کشمیر: زندگی کے دو خوش گوار ہفتے'' کے عنوان سے روزنامہ ''انقلاب'' لاہور میں قسطوں کی صورت میں شائع ہوئی۔ اخبار کے فائل سے اس کی نقل حاصل کر لی گئی ہے اور مرتب کی جا رہی ہے۔ مولانا مہر نے ۱۹۵۱ء میں کاغان کا مطالعاتی دورہ بھی کیا تھا اور پیش آمدہ واقعات اور مشاہدات کو سیر کاغان کے عنوان سے تحریر کیا۔ مولانا کا یہ معلوماتی اور تحقیقی سفرنامہ ابھی تک غیر مطبوع ہے۔ ان دونوں اسفار کی اشاعت کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔

